اللہ تعالیٰ کے رحم اور فضل کے ساتھ

ماہنامہ

فروری 2017

قندیل ادب

مدیر : راناعبدالرزاق خان

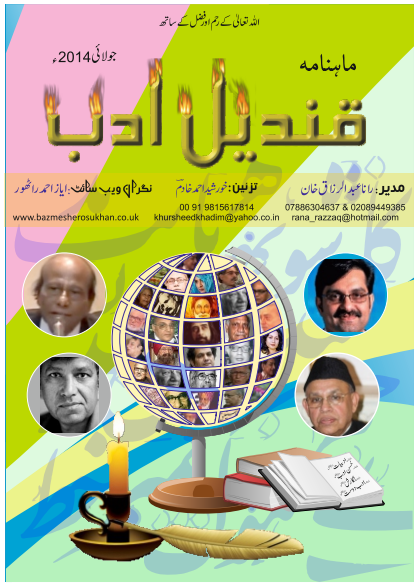

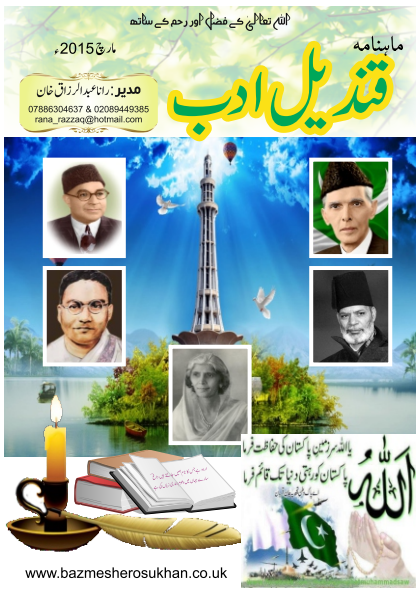

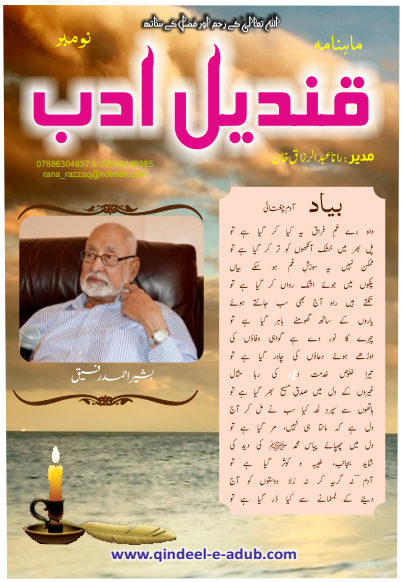

07886304637 & 02089449385

rana_razzaq@hotmail.com

www.qindeel-e-adub.com

مجلس ادارت

زکریا ورک، امجد مرزا امجد، ایم اے حق بھارت، خواجہ عبدالمومن ناروے، آصف علی پرویز

بانی رُکن: خان بشیر احمد رفیق مرحوم مدیر: رانا عبدالرزاق خاں معاون مدیر: سید حسن خان

مدیر خصوصی: سہیل لون مینجنگ ڈائریکٹر: عاصی صحرائی فوٹوگرافی: قاضی عبدالرشید، فضل عمر ڈوگر آڈیو وڈیو: محمد اشرف خاکی

اراکین مشاورتی بورڈ

آدم چغتائی، منور احمد کنڈے، رضیہ اسمٰعیل برمنگھم، رند ملک کنیڈا، اسلم ناصر آسٹریلیا، اے حق یو کے ٹائمز، ثقلین مبارک آسٹریلیا، رانا مبارک احمد بحرین، بشیر احمد خان سویڈن، راجہ منیر احمد، ڈاکٹر منصور خوشتر بھارت، منور احمد خورشید۔ طارق مرزا، محمد اسحٰق عاجز۔

فہرست

آپ کے خطوط		2
غزلیات: اطہر فراز حفیظ، مبارک صدیقی، فرید احمد نوید، شگفتہ شفیق، عبدالکریم قدسی، امجد مرزا امجدؔ، فراق گورکھپوری، چوہدری محمد علی مضطرؔ عارفی، آدم چغتائی، دلاور علی آزر، سلیم انصاری، عطاء المجیب، راشد، ارشد شاہین، سلیم فگار، ساجد رانا، راجہ محمد یوسف آف جرمنی، عباس تابش، مسعود چودھری، عامر امیر، اشرف گل، غالب ماجدی، عبدالجلیل عباد، حبیب جالب، فہمیدہ مسرت احمد، اسد اللہ حسینی چکر امریکہ، تابش دہلوی، عاصی صحرائی، عبدالصمد قریشی، احمد منیبؔ، عذراؔ ناز، فنا بلند شہری، پروین شاکر، سدرشن فاقر، ڈاکٹر منور احمد کنڈے، طاہرہ زرتشت ناز۔		2-13
نثریات: سوچئے اور پھر سوچئے	عطاء القادر طاہر	13
ہمہ صفت جہتوں کے قلمکار۔ رانا عبدالرزاق خان	امجد مرزا امجدؔ	14
مسلمان دہشت گرد نہیں ہوسکتا	احمد منیب	16
تنزانیہ نام کیسے اور کس نے رکھا	ڈاکٹر فضل الرحمان	18
افسانہ۔ ایش ٹرے	توصیف بریلوی	19
پاکستانی طیاروں کو پیش آنے والے 16 بڑے حادثات	عاصی صحرائی	22
شیخ محمد اسماعیل پانی پتی	زکریا ورک کینیڈا	23
تلور کی کہانی، پاکستانی مسلمانوں کی دلالی	محمد وجاہت	25
پرانا دور، یہ زمانہ کس کس نے دیکھا ہے	ابن لطیف	26
اردو کے دس بہترین ناول	رجل خوشاب	26
قصہ اردو ناول کے ایک درویش کا...	وسعت اللہ خان	30
بغض معاویہ یا اسلامی رواداری	وسعت اللہ خان	31
شیخ محمد احمد مظہر ایڈووکیٹ بیسویں صدی کا شہر آفاق ماہر لسانیات	دوست محمد شاہد مرحوم (مورخ)	32
قوم کا زوال کیوں	اے آر خان	32
مجلس احرار اور قیام پاکستان	ڈاکٹر مرزا سلطان احمد	33
گدھا	سید حسن خان	35
جناب جہاد میں آپ کے بچے کیوں نہیں شہید ہوئے رند ملک		36
ایک ہر دل عزیز شاعر، مبارک صدیقی	عاصی صحرائی	38
ایک مختصر تحقیقی مقالہ مسلم تاریخ اور چھ کونوں والا ستارہ	مولانا دوست محمد شاہد	41
معراج محبت مسجد نبوی	بلال افتخار	42
زنانہ اُردو خط و کتابت	شفیق الرحمن	43

آپ کے خطوط

محترم زکریا ورک صاحب لکھتے ہیں۔

مسلسل چار سال کے استقلال نے آپ کو عزت و رفعت عطا کی ہے۔قندیل ادب اب ساری دنیا میں لاکھوں کی تعداد میں قارئین اسے شوق و ذوق سے پڑھتے ہیں۔ حوصلہ نہیں ہارنا۔ادب کی خدمت میں مگن رہیں۔خدا آپ کو صحت والی طویل عمر دے۔آمین۔

محترم مجیب محمود انجینئر پاکستان سے لکھتے ہیں۔

سلام و آداب

آپ کی چار سالہ کاوش پر مبارک باد۔ٹائیٹل پیج پر مظلوموں کی مساجد کو جلانے اور زبردستی قبضہ جمانے کی جو نام نہاد اسلام کے ٹھیکیداروں کے کرتوت کی جو تصویر دی ہے۔یہ آپ کی بلند کردار کی عظمت کی دلیل ہے۔خدا حق گو کو کبھی ضائع نہیں کرتا۔

محترمہ طاہرہ زرتشت ناز صاحبہ ناروے سے رقم طراز ہیں۔

محترم رانا صاحب السلام وعلیکم۔

قندیل ادب انٹرنیشنل ملا۔دیکھ کر بہت خوشی ہوئی۔اللہ آپ کی مساعی میں برکت ڈالے۔آمین۔بہت دلچسپ مضامین اور خوبصورت غزلوں سے رسالہ مزین ہے۔اگر ممکن ہو تو ثاقب زیروی اور جون اولیا کا کلام بھی دیا کریں۔افسانہ لفٹ بہت پسند آیا۔شکریہ

محترم نعیم احمد راٹھور امریکہ سے لکھتے ہیں۔

محترم رانا صاحب مدیر قندیل ادب انٹرنیشنل

آداب

شمارہ جنوری میں قلندر مومند کے ذکرِ خیر کو پڑھ کر دل کے پھپھولے جل اُٹھے۔مجھے مرحوم سے 1960 سے نیاز حاصل رہا۔جب میں پشاور یونیورسٹی کا طالب علم تھا۔مضمون نگار نے غالباً طوالت کے ڈر سے ان کی بہت سی خوبیوں کا تذکرہ کما حقہ نہیں کیا،قلندر تذکرہ صاحبزادہ امتیاز صاحب سابق وفاقی محتسب کے بغیر تشنہ رہے گا جو کہ اُن کے بہت ہی محب تھے۔اللہ تعالیٰ آپ کی قندیل ہمیشہ روشن رکھے۔امریکہ میں کوئی اکاؤنٹ بتادیں تو بندہ اس میں 40 ڈالر جلد ہی جمع کروادے گا۔شکریہ

ڈاکٹر عقیل اطہر صاحب امریکہ سے رقم طراز ہیں۔

محترم مدیر صاحب آداب

پہلے یہ خوبصورت میگزین بی اے رفیق مرحوم ارسال کیا کرتے تھے۔اب آپ کی طرف سے موصول ہوتا ہے۔شکریہ

قندیل ادب کے معیاری اور ادبی مضامین اور عمدہ شاعری پڑھ کر بہت خوشی ہوتی ہے۔اللہ آپ کی کوششوں میں مزید برکت ڈالے آمین۔ میں بھی کچھ اشاعت کے لئے کچھ ارسال کروں گا۔

سلیم انصاری جبل پور انڈیا سے لکھتے ہیں۔

محترم مدیر صاحب آداب

قندیل ادب مسلسل موصول ہو رہا ہے اور میں اس کے مندرجات سے محظوظ بھی ہو رہا ہوں۔اللہ تعالیٰ آپ کی محنتوں اور قربانیوں کو قبول فرمائے۔آمین۔

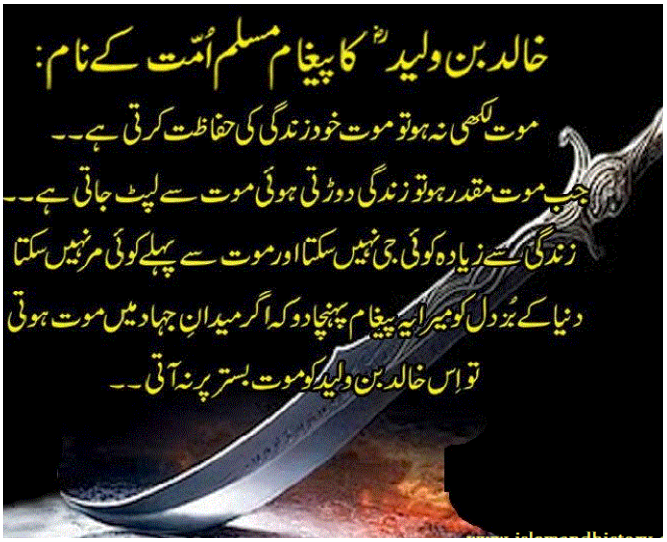

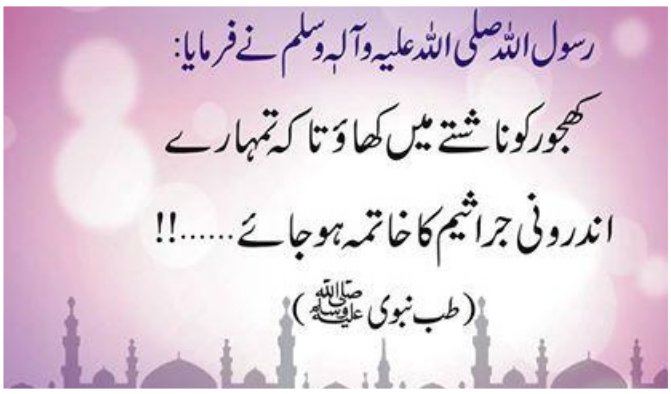

غزلیات

نعت

اطہر فراز حفیظ

محمدؐ کی دعاؤں نے فلک سارے ہلا ڈالے
تکبر سے جو اٹھتے تھے، وہ سر نیچے جھکا ڈالے
عرب کی سرزمیں پہ خوگر توحید جو آیا
بُتوں کے سب پجاری تھے، خدا والے بنا ڈالے
خداوند یگانہ کا جو اک نعرہ لگایا تھا
ہُبل عزیٰ لرز اُٹھے، وہ اُوندھے منہ گرائے گئے
ستارے ضوفشاں دیکھو اُسی کے دم قدم سے ہیں
وہ دھرتی چاند بنتی ہے ہو جس پہ نقش پا ڈالے
محمدؐ حسن و احساں میں مرا دلبر جو ٹھہرا ہے
کہاں ہے چاند میں جرائت کہ دل میں وہ شبہ ڈالے
محمدؐ کے چراغوں کی لہو سے لو بڑھائیں گے
بھلا دشمن ہمارا ہم پہ قدغن بھی لگا ڈالے
ضلالت سے ہدایت تک سماں کچھ اس طرح بدلا
وہ جو کنکر کی مانند تھے وہ سب ہیرے بنا ڈالے
فرازؔ المختصر یہ کہ محمدؐ کی عنایت ہے
شبِ ودیجور میں لاکھوں دیئے اُس نے جلا ڈالے

مبارک صدیقی

وہ بھی ہجر فسانے دل میں رکھنے والا نئیں
میں بھی قول قرار سے پیچھے ہٹنے والا نئیں
کون ہیں میرے دشمن سجن، سب کو ہے معلوم
میں پردوں کے پیچھے چھپ کر ملنے والا نئیں
رنگ سنہرا، جگمگ آنکھیں، سُندر رُوپ سرُوپ
ایسے قاتل حملے میں، میں بچنے والا نئیں
جانتا ہوں میں کیوں رہتے ہیں مجھ سے لوگ خفا
میں لوگوں کو جھوٹے سپنے بیچنے والا نئیں
اُس کو بھی دربار میں دیکھا جوڑے دونوں ہاتھ
وہ جو اکثر کہتا تھا میں بِکنے والا نئیں
دنیا زخم لگانے میں ہے تُو بھی پختہ کار
میں بھی تجھ سے پتھر کھا کر، گرنے والا نئیں
اُس سے کہنا، جیتنا ہے، تو پیار سے مجھ سے جیت
تُو نے خنجر پکڑا تو میں ہارنے والا نئیں
کاش مجھے وہ چاند کہے آ میرے پاس بھی بیٹھ
ویسے میں جو بیٹھ گیا تو اُٹھنے والا نئیں
عشق نگر کے رستے بھی ہیں پتھریلے پُرخار
میں بھی زخمی پیر کے چھالے گننے والا نئیں
میرے قاتل، منصف کیا، تو پورا شہر خرید
کچھ بھی ہو، میں تیرے حق میں بیٹھنے والا نئیں
اور کسی سے جا کے، جلتے گھر کی قیمت پوچھ
میں بازار میں بیٹھ کے آنسو بیچنے والا نئیں
میں ہوں عشق قبیلے سے، دُکھ درد میری میراث
مر جاؤں گا پیار مرا یہ مرنے والا نئیں

فرید احمد نوید

کہکشائیں، نہ کبھی چاند ستارے مانگے
شب گزیدوں نے فقط خواب تمہارے مانگے
جو مروت کے لئے وجہ مروت سوچیں
ایسے یاروں سے بھلا کون سہارے مانگے
اس قدر عادیٔ گریہ تھے کہ جانے پہ ترے
زندہ رہنے کے لئے درد اُدھارے مانگے
سانس کی لے پہ تری یاد میں دل یوں مچلے
جیسے سائل کسی بستی میں پکارے، مانگے
عشق طوفان میں لہروں کو پلٹ کر رکھ دے
عقل ساحل پہ کھڑی ہو کے کنارے مانگے
کس کو انکار ترے جود و مہربانی کا
دل محبت کے مگر صاف اشارے مانگے

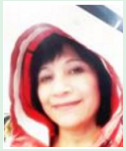

شگفتہ شفیق

پھر کوئی ہے سلسلہ الزام کا
یہ وطیرہ ہے عجب گلفام کا
وہ جلاتا ہے روزانہ شام کو
اِک دیا چھوٹا سا میرے نام کا
خوبصورت دلرُبا سی شاعری
سلسلہ ہے رُوح تک الہام کا
دل میں اپنے سوچتی ہوں میں کبھی
وقت آئے گا مرے آرام کا
چاہتوں کی بارشیں کرتا ہے وہ
خوب واقف ہے وہ اپنے کام کا
خود پرستی خوبیوں کو کھا گئی
یوں تو بندہ تھا بہت ہی کام کا
رات بھر لوگوں سے وہ چیٹنگ کرے
خیال کب کرتا ہے وہ آرام کا
ہم سے ملنے کو صبح آتا نہیں
وقت دیتا ہے ہمیشہ شام کا
وہ جنوں خیزی تو کب کی مٹ چکی
اب شگفتہؔ واسطہ ہے نام کا

بی اے رفیق
عبدالکریم قدسی

اک نفیس انسان تھے بی اے رفیق
صاحبِ ایمان تھے بی اے رفیق
حُرمتِ قصرِ خلافت کے لئے
اک جری دربان تھے بی اے رفیق
عہدِ وقفِ زندگی کو شان سے
ہے نبھایا آخری سانسوں تلک
تلخیٔ حالات کے باوصف وہ
مسکرایا آخری سانسوں تلک
چاروں خُلفا کا رہا حاصل قُرب
دست بستہ وہ خلافت کا غلام
سطرِ خوشنودی امامِ وقت کی
سب انعاموں سے بڑا اس کا انعام
پائے اخلاص و محبت کی جزا
ہو ٹھکانہ رحمتوں کی اوس میں
اپنے پیاروں کا خدا کے فضل سے
قرب پائے جنت الفردوس میں

عاصی صحرائی کے ساتھ منائی گئی ایک شام کے موقع پر

ریختہ کی ہیں ترقی سبب
رانا صاحب اور قندیلِ ادب
اسکو عزت دیجئے جس شخص کے
خدمتِ اُردو میں گزریں روز و شب
چار سالوں کی ہے محنت کا صلہ
یہ قلم کاروں کا مٹتا فاصلہ
کھا رہے ہیں حوصلہ شکنی کے تیر
رانا صاحب کا بڑا ہے حوصلہ
دُلہنِ سود و زیاں کو ایک بار
سر اُٹھا کر کبھی دیکھا نہیں
ڈھونڈتے ہیں نت نئے اہلِ قلم
اور حسابِ دوستاں رکھا نہیں

قطعاتِ قدسی

ہر اک شغل اذیت پسند ہے جن کا
براجمان ہیں ماحول کے سفینوں میں
میرے وطن کی سیاست کا حال مت پوچھو
گھری ہوئی ہے طوائف تماش بینوں میں

۲

دعاؤں کی اسے خیرات دینا
لبوں پر جو گدا بیٹھا ہوا ہے
گلہ آواز کا کرنا نہ قدسیؔ
کہ مدت سے گلا بیٹھا ہوا ہے

محترم عبدالرزاق
امجد مرزا امجدؔ

قندیلِ ادب جلاتے ہیں محترم عبد الرزاق
تختِ ادب لگاتے ہیں محترم عبد الرزاق
جانے کہاں سے لاتے ہیں شعراء کو ڈھونڈ کے
عزت سے سب بلاتے ہیں محترم عبدالرزاق
شاعروں کو دیکھ کے لاتے ہیں چہرے پر چمک
نغمہ ادب کا گاتے ہیں محترم عبد الرزاق
جانتے ہیں لوگ سب مصروف ہے ان کا قلم
پھولوں سے مسکراتے ہیں محترم عبدالرزاق
محفلوں میں لذتِ پیزا ہے اور بریانیاں
پکوان ہر کھلاتے ہیں محترم عبدالرزاق
یہ صاحبِ سخن ہیں کہ ان کی ہے نظم خوب
افکار پہ چھا جاتے ہیں محترم عبد الرزاق
حق میں دعا ہے آپ کے، ہاتھ آپ کے لئے
ہم تو سبھی اٹھاتے ہیں محترم عبد الرزاق
امجدؔ یہ میرے دوست ہیں ہر آن خوش رہیں
دل کو بہت لبھاتے ہیں محترم عبدالرزاق
ہو مقالہ یا غزل، ہو نثر یا نظم ہو
اپنا ہنر دکھاتے ہیں محترم عبدالرزاق

نغمہ
امجد مرزا امجد

چلو قدم بڑھائیں ہم
نیا جہاں بسائیں ہم
نئی زمیں نیا سفر
نیا ہے اپنا راہبر
ہیں ولولے جواں جواں
بلندیوں پہ ہے نظر
چلو قدم بڑھائیں ہم
نیا جہاں بسائیں ہم
رہے یونہی رواں دواں
یہ عزمِ نَو کا کارواں
کھِلیں گے گُل وہاں وہاں
قدم بڑھیں جہاں جہاں
بہار بن کے چھائیں ہم
چلو قدم بڑھائیں ہم
عُدُو کی راہ روک لو
قضا بنو، فنا بنو
رُکو نہیں، چلے چلو
بڑھے چلو، بڑھے چلو
عُدُو کا سر جھکائیں ہم
چلو قدم بڑھائیں ہم
یہ منزلیں، یہ فاصلے
یہ دُوریاں، یہ راستے
مصیبتوں کے مرحلے
یہ مشکلوں میں حوصلے

ہیں مُنتظر، کہ آئیں ہم
چلو قدم بڑھائیں ہم

یہ دلفریب وادیاں
مچلتی شوخ ندّیاں

یہ سبز سبز راستے
یہ لہلہاتی کھیتیاں

چلو اِنہیں بچائیں ہم
چلو قدم بڑھائیں ہم

فِراق گورکھپوری

کمی نہ کی ترے وحشی نے خاک اُڑانے میں
جنوں کا نام اُچھلتا رہا زمانے میں

فِراق! دَوڑ گئی رُوح سی زمانے میں
کہاں کا درد بھرا تھا مِرے فسانے میں

جنوں سے بھول ہوئی دِل پہ چوٹ کھانے میں
فِراق! دیر ابھی تھی بہار آنے میں

وہ کوئی رنگ ہے؟ جو اُڑ نہ جائے اے گلِ تر!
وہ کوئی بُو ہے؟ جو رُسوا نہ ہو زمانے میں

وہ آستیں ہے کوئی؟ جو لہو نہ دے نکلے!
وہ کوئی حسن ہے؟ جھجکے جو رنگ لانے میں

یہ گل کھلے ہیں کہ چوٹیں جگر کی اُبھری ہیں
نہاں بہار تھی بُلبُل ترے ترانے میں

بیانِ شمع ہے، حاصِل یہی ہے جلنے کا!
فنا کی کیفیتیں دیکھ جھلملانے میں

کِسی کی حالتِ دِل سُن کے اُٹھ گئیں آنکھیں
کہ جان پڑ گئی حسرت بھرے فسانے میں

غَرض کہ کاٹ دیئے زندگی کے دِن، اے دوست!
وہ تیری یاد میں ہوں، یا تجھے بھلانے میں

ہَمیں ہیں گل، ہَمیں بلبل، ہَمیں ہَوائے چَمن
فِراقؔ! خواب یہ دیکھا ہے قید خانے میں

بیانِ اہلِ درد
کلامِ مختار احمد شاہ جہانپوری

کیا کوئی بیدرد سمجھے گا بیانِ اہلِ درد
پوچھ اہلِ درد سے لطفِ زبانِ اہلِ درد

وہ تو ہیں بیدرد اُنہیں کیا قدر جانِ اہلِ درد
جانِ اہلِ درد پر صبر فغاں اہلِ درد

دیکھیے رہتا ہے کب تک یہ مصائب کا ہجوم
دیکھیے ہوتا ہے کب تک امتحانِ اہلِ درد

بدگماں بھی جانتے تھے اور انہیں بیدرد بھی
لیکن اس حد تک نہ پہنچا تھا گمانِ اہلِ درد

کچھ اثر ہوتا نہ ہوتا یہ تو تھی قسمت کی بات
سن تو لیتے وہ مگر اک دن بیانِ اہلِ درد

دیکھئے ہوتی ہیں اب کیا کیا ستم آرائیاں
کہہ چکے ہیں وہ کہ ہم ہیں اور جانِ اہلِ درد

ہے تصور میں کسی بیدرد سے یہ گفتگو
چشمِ بددُور آپ ہی ہیں مہربانِ اہلِ درد

آپ ہی کے خلق بے پایاں سے دل ہیں شادکام
آپ ہی ہیں خیر سے راحت رسانِ اہلِ درد

آپ ہی کے سر ہے سہرا عدل اور انصاف کا
اللہ اللہ آپ ہی ہیں قدردانِ اہلِ درد

اب تو صاحب حد سے گزریں آپ کی بیدردیاں
آپ کچھ دن آ کے بیٹھیں درمیانِ اہلِ درد

شکر للہ آج تو مختار وہ بھی بول اٹھے
سنئے اہلِ درد ہی سے داستانِ اہلِ درد

چوہدری محمد علی مضطرؔ عارفی

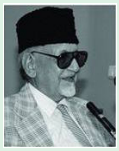

اندھیرا روشنی سے ڈر رہا ہے
مگر سورج کا چرچا کر رہا ہے

تمہارے نام کا تھا ذکر جس میں
وہ مضمون سب سے بالا تر رہا ہے

مبارک ہو ہمیں اُلفت کا الزام
یہ سہرا بھی ہمارے سر رہا ہے

صدی کے سر پہ اُبھرا ہے جو دُھل کر
وہ چہرہ آنسوؤں سے تر رہا ہے

یہی زندہ رہے گا درحقیقت
جو لمحہ مسکرا کر مر رہا ہے

دلِ ناداں کو بھی اَب قتل کر دو
یہی اِک شہر میں کافر رہا ہے

عدو جو بن رہا ہے آج اپنا
یہ کل تک غیر کا دلبر رہا ہے

علی المرتضیٰ کے شہسوارو!
وہ دیکھو سامنے خیبر رہا ہے

چھلک جائے گا وقت آنے پہ مضطرؔ!
یہ برتن قطرہ قطرہ بھر رہا ہے

آدم چغتائی
رنگِ تغزل

پھر سبیلِ چشمِ مے سے رنگِ پیا نہ کریں
خوش خرامِ زیست کو اُلجھن سے بیگانہ کریں

دُور رکھیں خونچکاں دیر و حرم کی داستاں
مست جو بیٹھے ہیں اُن کو اور مستانہ کریں

فتنہ پردازوں کے دل میں ڈال کر رنگِ وفا
اور حقیقت در حقیقت ایک افسانہ کریں

دورِ ماضی کی روایت کا جلائیں آفتاب
نورِ شمعِ قدس کو شانِ کریمانہ کریں

قطرۂ شبنم کو لے کر دامنِ گلزار سے
بانی گلشن کو جاکر پیش نذرانہ کریں

زُلف کے سائے میں جو بھی جی رہے ہیں آج تک
جگنوؤں کے نور سے ہم اُن کو دیوانہ کریں

مہ وشوں کے ساتھ چل کر کہکشاں میں ہم رہیں
رونقِ مہر و قمر میں اپنا کاشانہ کریں

دل تو آدمؔ کا تپاں آوارگی کا ہے شکار
تقویٰ کی مے سے اسی گھر کو پری خانہ کریں

عبدالکریم قدسیؔ

شاہ دیکھتے ہیں منصب عالی کی حیثیت
وہ دیکھتے نہیں ہیں سوالی کی حیثیت
دستِ سخی نے عزت و توقیر بخش دی
ورنہ تھی خاک دامنِ خالی کی حیثیت
پیوستہ جب تلک ہے شجر کے نصیب سے
تب تک خوشا نصیب ہے ڈالی کی حیثیت
نام و مقام مل گیا غالب کے نام سے
ورنہ ادب میں کچھ نہ تھی حالی کی حیثیت
چاہے زمانہ دے لے کڑی سے کڑی سزا
قائم رہے گی روحِ بلالی کی حیثیت
من بھائے جو پیا کے سہاگن وہی بنے
گوری کی حیثیت ہے نہ کالی کی حیثیت
قدسیؔ یہ سارا حسنِ نظر کا کمال ہے
ورنہ ہے خاک ہونٹوں کی لال کی حیثیت

دلاور علی آزر

لہجہ و لفظ کو اِک ساتھ بدل سکتا ہوں
بات کرتے ہوئے میں بات بدل سکتا ہوں
وہ بدلتا ہے اگر چاک پہ صورت اپنی
میں بھی یہ حرف و حکایات بدل سکتا ہوں
اُٹھ بھی سکتا ہے کبھی میرا یقیں تجھ پر سے
میں رُخِ قبلہ حاجات بدل سکتا ہوں
ابنِ آدم ہوں مرا کوئی بھروسہ بھی نہیں
چند سکوں کے عوض ذات بدل سکتا ہوں
وہ سمجھتا ہے کہ بے چین ہوں ملنے کے لیے
اور میں وقتِ ملاقات بدل سکتا ہوں
مجھ کو تصویر بنانے میں رعائیت جو ملے
نقشہ اَرض و سماوات بدل سکتا ہوں

سلیم انصاری

کیا خیال کو، لفظوں کو دلکشی دے گا
ترا جمال مرے غم کو زندگی دے گا
دعا کو ہاتھ اُٹھائے ہوئے ہے شہر کا شہر
وہ جس کو چاہے طلب کے بغیر بھی دے گا
مرے وجود کے اندر بھی ایک صحرا ہے
را وصال کہاں تک مجھے نمی دے گا
تو مجھ کو خود ہی جلانا پڑے گا اپنا بدن
مرے چراغ، اگر تو نہ روشنی دے گا
وہ شخص جس سے بچھڑنے کا ہے ملال بہت
اگر وہ لوٹ بھی آیا تو زخم ہی دے گا
سلیمؔ حد سے زیادہ خوشی بھی، تیرگی ہے
بچا رکھو کوئی آنسو کہ روشنی دے گا

نیا سال
مبارک صدیقی

منظر بھی نہیں بدلا،کردار بھی ویسے ہی
پھر درد کی بانہوں میں لپٹی ہوئی خبریں ہیں
مخبر بھی وہی چہرے، اخبار بھی ویسے ہی
کچھ اور نہیں بدلا، بدلا ہے کیلنڈر ہی
دشمن بھی وہی قاتل، اور یار بھی ویسے ہی
ویسے تو مسیحا بھی آتا ہے تخیل سے
ہو جاتا ہوں میں ویسے، بیمار بھی ویسے ہی
وہ محفل رنداں تھی، میں ہوش میں کیا کہتا
ساقی بھی نشے میں تھا، مے خوار بھی ویسے ہی
کچھ میری عقیدت بھی خوشبو سے پرانی تھی
کچھ اُس کے دوانے تھے،گلزار بھی ویسے ہی
جاؤں تو کہاں جاؤں، اُس پھول سی صورت کا
انکار بھی ویسے ہی، اقرار بھی ویسے ہی
اس درد فسانے کو ، چھوڑو نا مبارک جی
خود تم بھی پہیلی ہو، اشعار بھی ویسے ہی

عطاء المجیب راشد

خُلوص دل سے جو خالی ہو دوستی کیا ہے
دلوں کو نور نہ بخشے وہ روشنی کیا ہے
ہجوم یاس میں اِک وہی سہارا ہے
اگر وہ تھام لے مجھ کو تو پھر کمی کیا ہے
سجی ہوئی ہے یہ کائنات جس کے طفیل
دلوں میں وہ نہیں بستا تو زندگی کیا ہے
نصیب جس کو ہو غلامی ہو شاہِ بطحاؐ کی
نظر میں اُس کی بھلا تاج وسروری کیا ہے
خوشا نصیب جنہیں مل گیا وصالِ حبیب
وہی سکھاتے ہیں دنیا کو عاشقی کیا ہے
خدا کی راہ میں مرکر جو ہوگئے زندہ
انہیں کے دم سے کھُلے راز سرمدی کیا ہے
لہو کے قطروں سے بنتی ہے آبشارِ حیات
ہر ایک شہید بتاتا ہے بندگی کیا ہے
یہ حسنِ ذوق مرے دوستوں کا ہے راشدؔ
''وگر نہ شعر مرا کیا ہے شاعری کیا ہے''

ارشد شاہین

دستِ اَجل کے خوف سے زندوں کا شور ہے
دیمک زدہ شجر میں پرندوں کا شور ہے
میرے وطن میں آج بھی جنگل کا راج ہے
شہروں میں میریوحشی درندوں کا شور ہے
رہتے ہیں قرض خور بڑی موج میں یہاں
سنتے ہو جو، قرض دہندوں کا شور ہے

بکھرے ہوئے زمین پہ لاشے جا بجا
اور درمیاں شمار کنندوں کا شور ہے
ارشد مجھے یقین ہے کہ لائے گا انقلاب
مے خانۂ چمن میں رندوں کا شور ہے

سلیم فگار

بدن کی آگ پہ ہاتھوں کو تاپنے کے لئے
پڑی ہوئی ہے رات ابھی جاگنے کے لئے
چلا رہا ہے کوئی تیز دھار لمحوں کو
ہماری عمر کی رَسی کو کاٹنے کے لئے
ہوا کے دوش پہ رکھنے پڑیں گے پاؤں مجھے
زمیں کی قید سے اک روز بھاگنے کے لئے
لہو کے شور میں خاموشیوں کے بین سُنے
کسے ہیں فُرصتیں اس دل میں جھانکنے کے لئے
میں اپنی آنکھ کا کاسہ اُٹھا کے لایا ہوں
سیاہ رات سے اک خواب مانگنے کے لئے

ساجد محمود رانا

ٹوٹا ہوا دل حسرت و ارمان اُٹھا کر
لوٹا ہوں ترے کوچے سے میں مان اُٹھا کر
کچھ خواب ادھورے لیے اور چاک گریباں
لایا ہوں میں تقدیر کا سامان اُٹھا کر
بھولے سے کبھی اس نے مجھے جان کہا تھا
پھرتا ہوں میں کشکول میں وہ جان اُٹھا کر
ضربوں کی عنایت سے یہ تقسیم ملی ہے
تم کہتے ہو آیا ہوں میں نقصان اُٹھا کر
تشنہ ہیں مرے دل میں یہ لفظوں کے نگینے
پھرتے ہیں جگر میں کئی طوفان اُٹھا کر
لازم ہے کہ اب کوچ کروں دنیا سے ساجدؔ
مرتا ہوں میں اب زیست کا احسان اُٹھا کر

سبینہ سحر

مرے دل کا کوئی بھی غم مجھے سونے نہیں دیتا
مگر یہ ضبط ہے جو اب مجھے رونے نہیں دیتا
اگر اُس کی طرح ہرجائی ہونے کا میں سوچوں تو
مجھے ہرجائی میرا ظرف ہی ہونے نہیں دیتا
میں سونا چاہتی ہوں ہجر کی گہری اُداسی میں
مگر اک رتجگا ہے جو مجھے سونے نہیں دیتا
غموں کی رات طاری ہے مگر پھر بھی خماری ہے
سحرؔ کا اک نشہ ہے جو مجھے رونے نہیں دیتا

عباس تابش

بہتر ہے پھر سے یار جدا ہو جانا
آدمی کا بنتا نہیں خدا ہو جانا
جس کام سے بدنام ہوں ہم نام میرے
بہتر ہے اس شہرت سے لاپتہ ہو جانا
شرک کا ہو اگر ڈر سجدے میں
بہتر ہے اس نماز کا قضا ہو جانا
وفا اگر خفا یار کو کرتی ہے
بہتر ہے پھر یار سے بیوفا ہو جانا
وصال سے اگر زوال آتا ہے ان پر
بہتر ہے پھر ہجر میں تباہ ہو جانا
ہوش میں اگر یوں دل توڑنا دستور ہے
بہت اچھا ہے پھر کسی شراب کا نشہ ہو جانا
ملتا ہے اگر کوئی چھوڑ جانے کے لئے عباسؔ
بہتر ہے پھر ایسی بستی میں تنہا ہو جانا

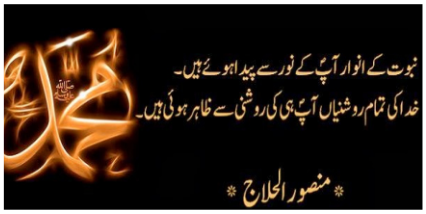

کامران احمد اعجاز

منزل نہیں ہے حالِ دلِ بیقرار کی
ڈوبا ہوں سوچ میں مَیں کے اعتبار کی
بزمِ سخن میں تھا اب صحرا میں آ گیا ہوں
ملتی نہیں بہاریں میرے بچھڑے حصار کی
تبسم کو ڈھونڈتا ہوں تخیل میں ڈوب کر
ویران ہر خوشی ہے دل ِبے اختیار کی
گلشن گھرا ہوا ہے مخفی سی آندھیوں میں
کلیاں اُجڑ رہی ہیں سبھی لالہ زار کی
آبِ چشم رواں ہے پلکیں ہیں شبنمی سی
منظر عجیب سی ہے میرے حالِ زار کی

راجہ محمد یوسف آف جرمنی

اے شقی القلب! جُبہ و دستار ہیں پر کام انسانی نہیں
کون سا فتنہ ہے جس کا آج تو بانی نہیں
قتلِ ناحق پر تجھے کوئی پشیمانی نہیں
اے شقی القلب! تجھ کو موت کیا آنی نہیں
ہے کوئی عمل تیرا جو شیطانی نہیں
کذب و استکبار میں کوئی ترا ثانی نہیں
بدقماش و جعلساز و خوگرِ مکر و فریب
کوئی بھی صورت تری دنیا میں اَن جانی نہیں
دُشمنِ حق خندہ زن ہے تیری ان حرکات پر
تجھ کو اے جاہل مگر کوئی پریشانی نہیں
کون سا انداز تیرا ہے لطیف و دل نشیں
کون سی تقریر تیری بادِ طوفانی نہیں
جس سے تو منسوب ہے اُس قریۂ صد رنگ کو
اپنے ہاتھوں سے جلا دینا نگہبانی نہیں

***

فرحت عباس شاہ

کوئی زیرو زبر نہیں بچتا
یہ تو طے ہے کہ شر نہیں بچتا
جیسے لوگوں میں آ گیا ہوں میں
اب تو رَختِ سفر نہیں بچتا
کشمکش جان لے کے چھوڑے گی
دل بچاؤں تو گھر نہیں بچتا
دیکھتا ہوں عجیب سا سپنا
دیکھتا ہوں نگر نہیں بچتا
کیا کرو گے یہ رَختِ جاں فرحتؔ
چھوڑ دو اگر نہیں بچتا

مسعود چودھری

راہزنوں کو راہبر، کیسے لکھوں
لکھنا بھی چاہوں مگر، کیسے لکھوں
تھی مرے ہمراہ تنہائی مری
اپنی رودادِ سفر، کیسے لکھوں
موج میں آ کر کسی صیّاد نے
کیسے کاٹے مرے پَر، کیسے لکھوں
دل کے ٹکڑے کرنے والے کو بھلا
اہلِ دل اہلِ نظر، کیسے لکھوں
آنسوؤں میں ڈوبی ہیں آنکھیں مری
حالِ دل اے نامہ بر، کیسے لکھوں
گامزن جس راہ پہ تھے ہم کبھی
کیا ہوئی وہ رہگزر، کیسے لکھوں
بجھ گئے ہیں میری خواہش کے چراغ
سطحِ کاغذ پر گہر، کیسے لکھوں
زندگی تیرے تصور کے بغیر
کیسے ہوتی ہے بسر، کیسے لکھوں
جس کے ہاتھوں اب شفا ممکن نہیں
اس کو اپنا چارا گر، کیسے لکھوں
جب حقیقت کا نمائندہ ہوں میں
ظلمتِ شب کو سحر، کیسے لکھوں
بے وفا محبوب کو مسعودؔ میں
زینتِ شمس و قمر، کیسے لکھوں

عامر امیر

عشق میں نے لکھ ڈالا ''قومیت'' کے خانے میں
اور ''تیرا دل'' لکھا ''شہریت'' کے خانے میں
مجھ کو تھربوں نے باپ بن کے پالا ہے
سوچتا ہوں کیا لکھوں ''ولدیت'' کے خانے میں
میرا ساتھ دیتی ہے میرے ساتھ رہتی ہے
میں نے لکھا ''تنہائی'' ''زوجیت'' کے خانے میں
دوستوں نے جا کر جب مشورہ کیا تو پھر
میں نے کچھ نہیں لکھا ''حیثیت'' کے خانے میں
امتحاں محبت کا پاس کر لیا میں نے
اب یہی میں لکھوں گا ''اہلیت'' کے خانے میں
جب سے آپ میرے ہیں فخر سے میں لکھتا ہوں
نام آپکا اپنی ''ملکیت'' کے خانے میں

صابر ظفر

جشنِ وصال کی لاکھ سبیلیں اور سنجوگ ہزار
ایک مجھے بس تُو نہیں ملتا، ویسے لوگ ہزار
تیرے دھیان کی دیوالی میں، ہر دم رقص کروں
چھوڑ کے اس نگری کو چاہے، لے لوں جوگ ہزار
حُسن کی رغبت سے بھی زیادہ، طاقت عشق میں ہے
جی نہیں بھرتا میرا، چاہے کرلوں بھوگ ہزار
اگر یہاں میرا یار نہ ہو تو رہوں یہاں میں کیوں
ساتھ مگر نہیں رہتا چاہے کروں میں سوگ ہزار
بھیس بدل کے جوگی والا، گاتا پھرے ظفرؔ
عشق میں روگ ہزار سائیں، عشق میں روگ ہزار

اشرف گل

کچھ آنکھ ملانے سے کر لی ہے نظر زخمی
کچھ روگ چھپانے سے کر بیٹھے جگر زخمی
اخبار کی ہر سرخی یوں سرخ لگے ہر دن
سطروں کے بدن چھلنی الفاظ کے سر زخمی!
چاہت کی مسافت میں کیسا ہے یہ دوراہا
تم ہو کہ ادھر زخمی اور ہم ہیں اِدھر زخمی
شیطان کے ہونے سے شیطان مزا لوٹیں
انسان کے ہاتھوں سے انسان مگر زخمی
کیا خوب نظامت ہے ارباب حکومت کی
مزدور کساں نالاں تعلیم و ہنر زخمی
گاؤں میں بھی اُداس اشرفؔ ہیں شہر میں بھی فریادی
ہر راہ گزر گریاں ہر ایک نگر زخمی

غالب ماجدی

دنیائے خار زار سے دامن بچا کے چل
مت دیکھ دلفریبیاں نظریں بچا کے چل
زادِ سفر سنبھال رکھ آجائے کب اَجل
اعمال نامہ اپنا بغل میں دبا کے چل
مانا کے تو حسین ہے لیکن نہ کر غرور
نخوت سے یوں نہ راہ میں فتنے جگا کے چل
میں نے کہا آ ذرا تنہائی میں چلیں
مجھ کو یقین نہ آیا جب اس نے کہا کہ چل
اب تو شریف زادوں کا جینا حرام ہے
شہباز اور نواز بہت بچ بچا کے چل

اُستاد فن ہیں بیٹھے ہوئے اُن کو سننے دے
تکبندی جلد غالبؔ خستہ سنا ہے چل

عبدالجلیل عباد

جذبوں سے برف بھرتا ستم گر گزر گیا
یہ سال اور یہ سرد دسمبر گزر گیا
اس سال بھی ہجوم دل بت کدے میں تھا
سوچا تو سارا آنکھ سے منظر گزر گیا
امسال پھر ڈبو کے سمندر گزر گیا
اس مرتبہ ہوا کے ارادے نہیں تھے نیک
میں جانتا تھا آنکھ بچا کر گزر گیا
کھویا رہا میں سوچ کے جنگل میں اس طرح
سمجھا مسافروں نے قلندر گزر گیا
کہتا تھا سرد رُت میں وہ آئے گا لوٹ کر
برفوں پہ آس لکھتے دسمبر گزر گیا
اِک لمحہ جو حیات میں خوشبو سی بھر گیا
لگتا ہے وہ نصیب کا سندر گزر گیا

شائق نصیر پوری

یاد کس کی آگئی ہے آج آدھی رات کو
ذہن سے غائب کیا خواب کی ہر بات کو
عشق کا وہ دور بھی تو اک کڑا تھا امتحاں
جیت میں بدلا خدا نے جب میری ہر اک مات کو
آ گرے سکّے مرادوں کے میری جھولی میں صبح
رات کو جب بھی پکارا ہے خدا کی ذات کو
بات کیا اُس نے تو دیکھا ہی نہیں مُڑ کر مجھے
میں ترستا رہ گیا تھا پیار کی خیرات کو
ٹوٹے پیمانے،اُداس میکدے میں دیکھ کر
مسکرا کر پی گیا میں تلخیٔ حالات کو
جب مسائل کی خراشوں نے بدن زخمی کیا
زور سے شائقؔ نے بھی پھر آواز دی برسات کو

عبدالقدیر کوکب

تڑپ مجھ کو ملنے کی محبوب سے ہے
دُکھوں کی دوا جو بتایا ہے کرتا
ملاقات سے ملتا دل کو سکوں ہے
حقیقی محبت بڑھایا ہے کرتا
ہے چاہت میں اُسکی میری جاں قرباں
مجھے پاس اپنے بٹھایا ہے کرتا
وہ نزدیک ہو تو ہے دل کو تسلی
ہجر میں مجھے وہ رُلایا ہے کرتا
جہاں تک نگاہ میری پہنچے کبھی نہ
وہ منظر ہے کیا، وہ بتایا ہے کرتا
جو رہتا ہے کوکب کے دل میں ہمیشہ
وہ سپنوں میں اکثر ہی آیا ہے کرتا

فہمیدہ مسرت احمد

شہر ویران کر دیا دل کا
دیکھو کیا حال ہو گیا دل کا
جابجا تو ہی تو نظر آیا
ہم نے دیکھا جو آئینہ دل کا
من کے مندر میں تیری مورت ہے
ہے تُو ہی ایک دیوتا دل کا
کس قدر مان سے سنایا تھا
نہ سنا تم نے ماجرا دل کا
کاش کہ ہم سنبھل کے چلتے ذرا
یوں تو ہوتا یہ حادثہ دل کا
ہائے ہم کس لئے کھڑے تھے وہاں
جہاں لٹنا تھا قافلہ دل کا
عقل اب تک ہے ہم پہ نوحہ کناں
ہم نے مانا تھا کیوں کہا دل کا
عمر گزرے گی کر چیاں چنتے
شیشہ پتھر پہ گر پڑا دل کا
جھانکیئے گا دلِ مسرتؔ میں
دیکھیئے حال ذرا دل کا

حبیب جالب

دل کی بات لبوں پر لاکر اب تک ہم دکھ سہتے ہیں
ہم نے سنا تھا اس بستی میں دل والے بھی رہتے ہیں
بیت گیا ساون کا مہینہ موسم نے نظریں بدلیں
لیکن ان پیاسی آنکھوں سے اب تک آنسو بہتے ہیں
ایک ہمیں آوارہ کہنا کوئی بڑا الزام نہیں
دنیا والے دل والوں کو اور بہت کچھ کہتے ہیں
جن کی خاطر شہر بھی چھوڑا جن کیلئے بدنام ہوئے
آج وہی ہم سے بیگانے بیگانے سے رہتے ہیں
وہ جو ابھی اس رہگزر سے چاک گریباں گزرا تھا
اس آوارہ دیوانے کو جالبؔ جالب کہتے ہیں

اسداللہ حسینی چکرامریکہ

مزاحیہ غزل

نہ تو شوہر کو حاجت ہے نہ بیوی کو ضرورت ہے
یہاں شادی ہے جس کا نام ایک تکمیل حجت ہے
خفا کیوں ہو اگر تم سے مجھے کوئی شکایت ہے
تمہاری طوطا چشمی پر تو طوطے کو حیرت ہے
وہ کرتے ہیں مجھے تاکید وعدہ بھول جانے کی
جنہیں خود وعدے بھلا دینے کی عادت ہے
تمہارا ''ویٹ'' اتنا ہے کہ اُٹھنا بیٹھنا مشکل
پھر اس پہ کمر لچکا کے چلنا اک قیامت ہے
اگر چاہوں تو ہر ہفتے نیا دیوان چھپوالوں
مجھے اشعار لوگوں کے چرانے میں مہارت ہے
ہوئی پالٹکس جو داخل حسن وعشق میں چکرؔ
حسینوں کی محبت میں بھی پوشیدہ سیاست ہے

تابش دہلوی

مِرے دِل کے بَست و کشاد میں یہ نمود کیسی نمو کی ہے
کبھی ایک دجلہ ہے خون کا، کبھی ایک بوند لہو کی ہے
کبھی چاکِ خوں سے چِپک گیا، کبھی خار خار پِرو لِیا
مِرے بخیہ گر نہ ہوں مُعترض، کہ یہ شکل بھی تو رفو کی ہے
نہ بہار ان کی بہار ہے، نہ وہ آشیاں کے، نہ وہ باغ کے !
جنھیں ذکر، قید و قفس کا ہے، جنھیں فکر، طوق و گلو کی ہے
یہی رہگزر ہے بہار کی، یہی راستہ ہے بہار کا
یہ چمن سے تا بہ دَرِ قفَس، جو لکِیر میرے لہو کی ہے
نہ جنوں، نہ شورِ جنوں رہا، تِرے وحشیوں کو ہوا ہے کیا ؟
یہ فِضائے دہر تو منتظر، فقط ایک نعرۂ ہو کی ہے
ہمیں عمر بھر بھی نہ مِل سکی، کبھی اِک گھڑی بھی سکون کی
دلِ زخم زخم میں چارہ گر! کوئی اِک جگہ بھی رفو کی ہے ؟
تِری چشمِ مَست نے ساقیا! وہ نظامِ کیف بَدل دِیا
مگر آج بھی سَرِمیکدہ، وہی رسم جام و سبو کی ہے
میں ہزار سوختہ جاں سہی، مِرے لب پہ لاکھ فغاں سہی
نہ ہو نا اُمید ابھی عِشق سے، ابھی دِل میں بوند لہو کی ہے
ابھی رِند ہے، ابھی پارسا، تجھے تابشؔ آج ہوا ہے کیا ؟
کبھی جستجو مے و جام کی، کبھی فکر آب و وضو کی ہے

عبدالصمد قریشی

شب تاریک کے پردوں سے سحر ہو جائے
میرے مولیٰ میرے گلشن پہ نظر ہو جائے
دور ہو جائیں مرے گھر سے بلائیں ساری
اس کا ہر شہر محبت کا نگر ہو جائے
کاش احساس کی راہوں کو سنوارے کوئی
دل کی گلیوں سے ہواؤں کا گزر ہو جائے
ختم ہو جائیں سبھی کذب و ریا کی باتیں
حسن و احسان ہے کیا سب کو خبر ہو جائے
نفرت و قہر کی رسموں کو مٹانے کے لئے
اس کا ہر پیرو جواں سینہ سپر ہو جائے
کوئی تدبیر کریں دورِ خزاں اب جائے
اس گلستاں پہ بہاروں کا اثر ہو جائے
اے میرے دیس تیری مانگ ستارے سے سجے
تیرا ہر ذرّہ حسیں لعل و گہر ہو جائے

عبدالجلیل عباد

اے دیس سے آنے والے ترے چہرے پہ سب کچھ لکھا ہے
کیا حال چھپائے چھپتا ہے ہنس دینے سے دُکھیاروں کا
ہاں اب بھی راج سنگھاسن پر ہے قبضہ ظالم لوگوں کا
ہاں اب بھی سکہ چلتا ہے ان ظلمت کے سرداروں کا
ہاں اب بھی ہجرت قسمت ہے اس دیس میں قوم پرستوں کی
ہاں اب بھی ڈھایا جاتا ہے گھر دیس کے معماروں کا
ہم روشنیوں کے پیکر ہیں ہمیں چھوڑو تیز ہواؤں میں
ہم جل جائیں تو ٹوٹے کا پندار انہی اندھیاوں کا

کروڑوں ہونکتے فتنوں کا گہوارہ

کلام عاصی صحرائی

جس دیس کے منصف خانوں میں انصاف ٹکوں میں بکتا ہو
جس دیس کا منشی قاضی بھی مجرم سے پوچھ کے لکھتا ہو
جس دیس کے چپے چپے پر پولیس کے ناکے ہوتے ہوں
جس دیس کے مسجد مندر میں ہر روز دھماکے ہوتے ہوں
اس دیس کے ہر اک لیڈر کو سولی پہ چڑھانا لازم ہے
جس دیس میں جان کے رکھوالے خود جانیں لیں معصوموں کی
جس دیس میں حاکم ظالم ہوں سسکی نہ سنیں مجبوروں کی
جس دیس کے عادل بہرے ہوں آہیں نہ سنیں مظلوموں کی
جس دیس میں بنتِ حوّا کی چادر بھی داغ سے میلی ہو
جس دیس میں چور اچکوں نے ہر سعد بنایا بیلی ہو

اس دیس کے ہر اک لیڈر کو سولی پہ چڑھانا لازم ہے

جس دیس کے لوگ ڈٹھائی سے ناجائز انکم کھاتے ہوں
اور قہرِ خدا دکھلانے کو طوفان وہاں پر آتے ہوں
باریش وہاں کے تاجر ہوں اور سود کی کھٹی کھاتے ہوں
زرگر بھی قسمیں کھا کھا کر سونے میں کھوٹ ملاتے ہوں
ہر لیڈر لگے یہودی ہے اور دل کا وہ ''زرداری'' ہے
اور جس کا نہیں علاج کوئی ہر اک کو وہی بیماری ہے
ایوان میں بیٹھے ارکاں کی تعلیم کی ڈگری جعلی ہے
جس دیس میں رشوت خوری ہے اور ہر راشی سرکاری ہے
اس دیس کے ہر اک لیڈر کو سولی پہ چڑھانا لازم ہے

جس دیس میں مدفوں مردوں کو قبروں سے نکالا جاتا ہو
اور دھکے دے کر مومن کو مسجد سے نکالا جاتا ہو
جس دیس کے طالب علموں کو نفرت ہی پڑھائی جاتی ہو
فرقوں میں بٹ کر رہنا ہے یہ بات سکھائی جاتی ہو
اس دیس کے ہر اک لیڈر کو سولی پہ چڑھانا لازم ہے

جس دیس کے عہدیداروں سے عہدے نہ سنبھالے جاتے ہوں
جس دیس میں عدل کی فائل کو پہیے ہی لگائے جاتے ہوں
جس دیس میں ناحق تاثیر سلمان مرائے جاتے ہوں
جس دیس میں تاوان کے لئے بچوں کو اٹھایا جاتا ہو
سِکوں کے لئے معصوموں کو ناحق ہی پھنسایا جاتا ہو
حق بات کہے ''تاثیر'' کوئی، گولی سے اُڑایا جاتا ہو
اس دیس کے ہر اک لیڈر کو سولی پہ چڑھانا لازم ہے

جس دیس میں آٹے چینی کا بحران فلک تک جا پہنچے
جس دیس میں بجلی پانی کا فقدان حلق تک جا پہنچے
جس دیس میں دولت شرفاء سے ہر کام ہی غلط کراتی ہو
جس دیس میں دہشت گردی کے سب ''عالم فاضل'' عادی ہوں
جس دیس کا ملاں دھرتی پر بیدرد ہو اور فسادی ہو
جس دیس کی مسجد میں غنڈے اور برقع پوش جہادی ہو
کیا فرق اگر وہ شیعہ ہوں، یا سنی اور وہابی ہوں
وہ مسجد آتے جاتے ہوں، وہ لگتے لاکھ نمازی ہوں
وہ عاصیؔ لوگ مکفر ہیں خواہ صوفی ہوں یا حاجی ہوں
جس دیس کے ایواں میں بیٹھے بدکار ہوں اور شرابی ہوں
اس دیس کے ہر اک لیڈر کو سولی پہ چڑھانا لازم ہے

احمد منیبؔ

دن کے سائے کی طرح تم سائے کا پیچھا کرو
رات کے بیدار مغزو! رات سے پردا کرو
ٹل رہا ہے چاند، سورج آسماں کو کھا گیا
آنکھ کے باریک نقطو! اِتنا مت پھیلا کرو
کوچۂ عشاق کے دستور پر قائم رہو
بس میں تم کو دیکھتا ہوں،تم مجھے دیکھا کرو
ہونٹ میرے اب مری تشنہ لبی کو آگئے
دل کے چھالوں کا لہو اب روز و شب چوسا کرو
خوبیٔ تقدیر سے اِک دائرے میں آگئے
ابتدا اور انتہا کا ختم اب جھگڑا کرو
اِس شکستہ آرزو کو اَور ابھی خستہ کرو
ہوں مریضِ عشق مجھ کو وقت کا عیسیٰ کرو
اِس سے آگے آگہی میں ہو گی رُسوائی بہت
احتیاطاً سوچنا چھوڑو، نہ کچھ لکھا کرو

عذرؔا ناز۔ ریڈنگ۔ یوکے

طاقت، دولت، شہرت پیچھے چھوڑ آئے ہیں
ہم ایسی ہر عادت پیچھے چھوڑ آئے ہیں
ورثے میں جو بھی دکھ ہیں بانٹے مت جائیں
ایسی ایک وصیت پیچھے چھوڑ آئے ہیں
سونے کو گر چھو لیں تو مٹی بن جائے
لگتا ہے ہم قسمت پیچھے چھوڑ آئے ہیں
جو اک مدت تک جھنجوڑ سکے ذہنوں کو
ہم وہ تلخ حقیقت پیچھے چھوڑ آئے ہیں

اپنی سوچوں پر پچھتائیں گے سب اک دن
گہری ایک ندامت پیچھے چھوڑ آئے ہیں
ایک قیامت تو درپیش ہمیں ہے اب بھی
اور ہم ایک قیامت پیچھے چھوڑ آئے ہیں
جس نے مدت تک ہم کو برباد کیا ہے
وہ خود غرض محبت پیچھے چھوڑ آئے ہیں

فنا بلند شہری

میرے رشکِ قمر، تو نے پہلی نظر، جب نظر سے ملائی مزا آ گیا
برق سی گر گئی، کام ہی کر گئی، آگ ایسی لگائی مزا آ گیا
جام میں گھول کر حُسن کی مستیاں، چاندنی مسکرائی مزہ آ گیا
چاند کے سائے میں اے میرے ساقیا! تو نے ایسی پلائی مزا آ گیا
نشہ شیشے میں انگڑائی لینے لگا، بزمِ رِنداں میں ساغر کھنکنے لگے
مے کدے پہ برسنے لگیں مستیاں، جب گھٹا گھر پہ چھائی مزا آ گیا
بے حجابانہ وہ سامنے آ گئے، اور جوانی جوانی سے ٹکرا گئی
آنکھ ان کی لڑی یُوں میری آنکھ سے، دیکھ کر یہ لڑائی مزا آ گیا
شیخ صاحب کا اِیماں بہک ہی گیا، دیکھ کر حُسنِ ساقی پگھل ہی گیا
آج سے پہلے یہ کتنے مغرور تھے، لُٹ گئی پارسائی مزا آ گیا
آنکھ میں تھی حیا ہر ملاقات پر، سُرخ عارض ہوئے وصل کی بات پر
اس نے شرما کے میرے سوالات پہ، ایسے گردن جُھکائی مزا آ گیا
اے فنا شکر ہے آج بعدِ فنا، اُس نے رکھ لی میرے پیار کی آبرُو
اپنے ہاتھوں سے اُس نے مری قبر پہ، چادرِ گُل چڑھائی مزا آ گیا

پروین شاکر

اپنی رُسوائی، ترے نام کا چرچا دیکھوں
اک ذرا شعر کہوں اور میں کیا کیا دیکھوں
نیند آ جائے تو کیا محفلیں برپا دیکھوں
آنکھ کھل جائے تو تنہائی کا صحرا دیکھوں
شام بھی ہو گئی، دُھندلا گئیں آنکھیں بھی مری
بھولنے والے، میں کب تک ترا رَستہ دیکھوں
ایک اِک کر کے مجھے چھوڑ گئیں سب سکھیاں
آج میں خود کو تری یاد میں تنہا دیکھوں
کاش صندل سے مری مانگ اُجالے آ کر
اتنے غیروں میں وہی ہاتھ جو اپنا دیکھوں
تو مرا کچھ نہیں لگتا ہے مگر جانِ حیات
جانے کیوں تیرے لیے دل کو دھڑکتا دیکھوں
بند کر کے مری آنکھیں وہ شرارت سے ہنسے
بوجھے جانے کا میں ہر روز تماشا دیکھوں
سب ضدیں پوری کروں، ہر بات سنوں
ایک بچے کی طرح سے اُسے ہنستا دیکھوں
مجھ پہ چھا جائے وہ برسات کی خوشبو کی طرح
اَنگ اَنگ اپنا اُسی رُت میں مہکتا دیکھوں
پھول کی طرح مرے جسم کا ہر لب کھل جائے
پنکھڑی پنکھڑی ان ہونٹوں کا سایہ دیکھوں
میں نے جس لمحے کو پوجا ہے، اسے بس اک بار
خواب بن کر تری آنکھوں میں اُترتا دیکھوں
تو مری طرح سے یکتا ہے مگر مرے حبیب
جی میں آتا ہے کوئی اَور بھی تجھ سا دیکھوں
ٹوٹ جائیں کہ پگھل جائیں مرے کچے گھڑے
تجھ کو میں دیکھوں کہ یہ آگ کا دریا دیکھوں

سدرشن فاقر

کسی رنجش کو ہوا دو کہ میں زندہ ہوں ابھی
مجھ کو احساس دلا دو کہ میں زندہ ہوں ابھی
میرے رُکنے سے میری سانس بھی رُک جائے گی
فاصلے اور بڑھا دو کہ میں زندہ ہوں ابھی
زہر پینے کی تو عادت تھی زمانے والو !
اب کوئی اَور دَوا دو کہ میں زندہ ہوں ابھی
چلتی راہوں میں یونہی آنکھ لگی ہے فاقر
بھیڑ لوگوں کی ہٹا دو کہ میں زندہ ہوں ابھی

''سوچئے اور پھر سوچئے''

روزنِ دیوار سے!

پیشکش۔عطاء القادر طاہر

☆-ہر روز اپنا قول بدلنے والے کے حالات میں تبدیلی اس وقت آئے گی جب وہ اپنا فعل بدلے گا۔

☆-رکاوٹیں زندہ انسان کیلئے ہیں میت کیلئے ہر کوئی راستہ چھوڑ دیتا ہے۔

☆-وہ ساری زندگی دوسروں کیلئے بولتا رہا، جب مرا تو اس کیلئے ایک منٹ کی خاموشی اختیار کی گئی۔

☆-خدارا اتوار کی چھٹی ختم کرو کہ کام کا بھی کوئی دن ہونا چاہئے۔

☆-نیک کاموں میں تاخیر نہیں ہونی چاہئیے اور بعض کاموں میں تاخیر ہی نیکی ہے۔

☆-شور میں مجھے نیند نہیں آتی اور دل ہے کہ بے آواز دھڑکتا ہی نہیں۔

☆-ترازو کا متوازن ہونا زیادہ اہم اور قیمتی ہے ہر اس شے سے جو اس میں تولی جاتی ہے۔

☆-دوستو! تمام کشتیاں جلا دو کہ سب دریا سوکھ گئے۔

☆-انتظار جان لیوا ثابت ہوا، وہ موت کا منتظر تھا۔

☆-دل کا بائی پاس حالیہ برسوں میں سامنے آیا ہے، ذہن کو بائی پاس تو صدیوں سے کیا جا رہا ہے۔

☆-آنسو تو مرنے والے پر بہائے جاتے ہیں، زندہ لوگوں پر تو ہنسی آتی ہے۔

☆-وہ خیال جو مجھے سونے نہیں دیتا، میں نے کسی کو سنایا تو اسے نیند آنے لگی۔

☆-سر کھجانے والا ہر شخص سوچنے والا ہوتا ہے لیکن بیشتر کی سوچ سر کی خشکی سے متعلق ہوتی ہے۔

☆-انسان کی قبر ایک جگہ بنتی ہے جبکہ اس کی یادیں کئی سینوں میں دفن ہوتی ہیں۔

☆-جس شخص کو مسائل کے انبار میں بھی کھانا یاد رہے تو وہ جان لے کہ بھوک اس کا اصل مسئلہ ہے۔

☆-جس شخص کے لباس پر کوئی شکن نہیں اسکے ماتھے کو دیکھو تو نظر آجائے گی۔

☆-آج کا کام کل پر نہ ڈالو، کبھی ملک الموت کو بھی ایسا کرتے دیکھا ہے؟

☆-جب اس نے کہا کہ وہ اپنی پسند کی زندگی چاہتا ہے تو اس کا مطلب تھا کہ وہ اپنی مرضی کی موت مرنا چاہتا ہے۔

☆-میت پر جو چادر چڑھائی گئی وہ ان پھولوں سے تیار کی گئی تھی جو مرحوم کو ساری زندگی پیش نہیں کی گئی۔

☆-عجیب تماشہ ہے کہ دوائی خالی پیٹ نہیں کھائی جاسکتی اور پیٹ جیب سے بھرا نہیں جاسکتا۔

☆-چونکہ ہر عمارت کا مستقبل اور مقدر کھنڈر ہونا ہوتا ہے چنانچہ انسانی شخصیت کی تعمیر عمارتی اصولوں پر نہیں ہونی چاہئے۔

☆-خالی پیٹ سوچنا اس کیلئے ممکن نہیں اور بھرے ہوئے پیٹ سے وہ محض کھانے سے متعلق سوچتا ہے۔

☆-نظریاتی مخالف کو جان سے مار دینے کے آرزومند کو چاہئے کہ یہی حق مخالف کو بھی دے۔

☆-میں دوسروں سے پیچھے رہ گیا اس لئے کہ مجھے آگے کی فکر تھی۔

☆-ایک نیم پاگل اپنے ساتھی کو مکمل پاگل بنانے کی صلاحیت رکھتا ہے۔

☆-اس کا کردار ایسا ہے کہ آپ اُنگلی نہیں اُٹھا سکتے، پورا ہاتھ اُٹھانا پڑتا ہے۔

☆-جس کی پہلی پانچ کام نہیں کرتیں اس کی چھٹی حس بڑی کام کرتی ہے۔

آج کا لطیفہ

ایک آدمی تلوار لئے مسجد میں گیا اور آواز لگائی آپ میں کوئی سچا مسلمان ہے؟
ایک بزرگ بولے میں ہوں
آدمی انکو باہر لے گیا اور انکے قدموں میں بکرا ذبح کیا۔
پھر مسجد میں گیا تلوار سے خون ٹپک رہا تھا، لوگ گھبرا گئے وہ بولا
اور کوئی سچا مسلمان ہے؟
کسی نے آواز لگائی مولوی صاحب ہیں۔
مولوی غصے سے بولا: بکواس کر رہا ہے کمینہ
میں تو اعلان کروانے آیا تھا کہ پرسوں سے کیبل نہیں آرہی

novelpk.com

ہمہ صفت کئی جہتوں کے قلمکار رانا عبدالرزاق خاں صاحب

تعارف: امجد مرزا امجدؔ

آپ کا پورا نام رانا عبدالرزاق خاں ہے جبکہ تخلص عاصی صحرائی لکھتے ہیں۔ مگر انہوں نے بے شمار مضامین و کالموں میں اپنے مختلف قلمی نام لکھے جو اے آر راجپوت، رجل خوشاب، ابنِ لطیف۔ اے آر خاں وغیرہ ہیں۔ قوم راجپوت گھوڑے واہ (والدین کا اصل وطن کاٹھگڑھ ہوشیار پور پنجاب انڈیا) ہے۔ تاریخ پیدائش: ۱۳/اپریل ۱۹۵۱ء ککی نو، شورکوٹ جھنگ۔ پرائمری تک تعلیم چک نمبر ۲ ٹی ڈی اے قائدآباد خوشاب ٹی آئی ہائی سکول ربوہ سے میٹرک، ٹی آئی کالج ربوہ سے ۱۹۷۰ء میں ایف اے کیا۔ بی اے پنجاب یونیورسٹی لاہور (۱۹۷۵ء) سے کیا، اُردو فارسی سپیشل مضامین تھے۔ پھر جب ملازمت کا دور شروع ہوا تو سپروائزر پیپر بورڈ ملز پیکیجز لمیٹڈ لاہور میں رہے پھر بحرین میں بطور ایگریکلچر اسسٹنٹ کام کیا۔ پاکستان جا کر اپنے گاؤں مارچ ۱۹۸۴ء تا جولائی ۲۰۰۸ء تک بطور نمبر دار چک نمبر ۲ ٹی ڈی اے خوشاب میں خدمات دیں۔ پھر جب باہر آنے کا شوق اُبھرا تو ۲۹/اکتوبر ۲۰۰۵ء کو لندن تشریف لے آئے اور ٹوٹنگ وانڈز ورتھ مقیم ہوئے جہاں تا حال موجود ہیں۔ پاکستان میں ۱۹۹۱ء سے روزناموں میں مختلف شخصیات کے تعارف لکھتے رہے۔ لندن میں آ کر ۲۰۰۹ء میں فراغت ملنے پر ''بزم شعروسخن'' تشکیل دی جس کا پہلا مشاعرہ ۲۰۰۹ء میں منعقد کیا۔ جس میں، امجد مرزا امجد، شکیل مرزا، سلطان صابری، ابراہیم رضوی، عذرا ناز، ڈاکٹر صوفیہ سطوت، حمیدہ معین رضوی، کوثر علی، فرحانہ غزالی، اقبال مجیدی، ساجد رانا، نورالجمیل نجمی، اطیب جاذل، محمود علی محمود، طفیل عامر، قدیر کوکب، ریاست رضوی، مبارک صدیقی، سید نصیر احمد شاہ، عامر امیر، عبدالمجید ظفر، نورالجمیل نجمی، جواد عالم، سہیل لون، آدم چغتائی، شگفتہ شفیق، سلیم فگار، ارشد لطیف، اقبال مرزا، ہارون الرشید اور دیگر بہت سے شعراء شامل ہوئے۔ اب تک ان گنت کامیاب مشاعرے کروا چکے ہیں اور یہ سلسلہ نہایت کامیابی کے ساتھ جاری وساری ہے۔ جس میں لندن کے نامور شعراء نے حصہ لیا۔ ۲۰۱۱ میں یوکے ٹائمز میں بھی کالم لکھنے شروع کئے۔ اور گوشہ اَدب کی ادارت سنبھالی۔ مگر غالباً کچھ مدت کے بعد ہی یہ فرض مجھے سونپ دیا گیا جس کو میں نے چار سال تک جاری رکھا مگر کچھ وجوہات سے میرے ختم کرنے کے بعد انہوں نے دوبارہ یہ ذمہ داری اپنے سر لے لی اور بڑی خوبصورتی کے ساتھ نبھا رہے ہیں۔ فرق صرف یہ ہے کہ میں یہ کام اُجرت کے ساتھ کرتا تھا اور آپ مفت کر رہے ہیں جو ان کی بڑائی کی دلیل ہے۔ جنوری ۲۰۱۳ء سے ''قندیل اَدب انٹرنیشنل لندن'' سے آن لائن میگزین نکالنا شروع کی جو کہ ساری دنیا میں لاکھوں قارئین تک بذریعہ ای میل اور ویب سائٹ پہنچتا ہے۔ اس کے علاوہ پاکستان، لندن، امریکہ، آسٹریلیا، انڈیا کے مختلف جرائد میں چار صد سے زائد مختلف عنوانات پر سیاسی، علمی، مذہبی، اور اُردو پر مضامین شائع ہوئے۔

پانچ کتب زیرِ طبع

* ۔میری سرگزشت
* ۔قندیل علم
* ۔میرے کالم
* ۔دانشکدہ عظیم کی تاریخ
* ۔میری شاعری

آپ نے زیادہ غزل ہی میں طبع آزمائی کی ہے۔ پاکستان، امریکہ، آسٹریلیا، انڈیا۔ انڈیا کے مختلف اخبارات میں بھی ان کے آرٹیکل شائع ہوتے رہتے ہیں۔ رانا عبدالرزاق خاں صاحب سے میرا تعارف ان کے بین الاقوامی مسائل پر نہایت پر دلائل اور ملکی حالات حاضرہ پر بڑی گہرائی میں لکھے ہوئے کالم پڑھ کر ہوا پھر چند مشاعروں میں ان سے ملاقات کا شرف حاصل ہوا میرے ماہانہ منعقد کردہ

مشاعروں میں بھی وہ کئی بار مہمان خصوصی کی حیثیت سے شریک ہوئے آپ نہایت پرخلوص اور سنجیدہ طبیعت کے انسان ہیں۔ میں آپ کے تحریر کردہ کالموں سے متاثر تو تھا ہی مگر جب انہوں نے کچھ مدت پہلے اپنی ایک ضخیم کتاب کا مسودہ مجھے بھیجا تا کہ میں اسے کتابی شکل میں دے کر شائع کرواؤں تو پڑھ کر حیران رہ گیا کہ انہوں نے کس قدر محنت، عمیق مشاہدے، مطالعے سے اور کتنی تفصیل دیکر اسے حوالہ تحریر کیا۔ اس میں انہوں نے مذہبی، سیاسی، معاشرتی اور ادبی تاریخ کا نہایت گہرائی کے ساتھ احاطہ کیا ہے جو قارئین کے لئے بیش بہا معلومات مہیا کرتا ہے۔

میں اپنے لئے اعزاز سمجھتا ہوں کہ انہوں نے مجھے بھی اپنے اس تاریخی پروجیکٹ میں شامل کیا اور اس طرح مجھے اس تاریخی خزانے سے مستفید ہونے کا موقع ملا۔ میں اس کتاب کی تفصیل میں نہیں جاؤں گا کہ وہ ابھی تک کیوں شائع نہ ہوسکی جبکہ ان کے مزید کئی مسودے لائن میں لگے ہوئے ہیں ہر کسی کے اپنے اپنے مسائل ہوتے ہیں۔ مگر یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ اتنے اہم موضوعات کو یکجا کر کے اس قسم کی کتاب شاید برطانیہ میں ابھی تک نہیں لکھی گئی جس میں ادبی مذہبی و سیاسی اکابرین کے بارے میں معلومات کا ایک وسیع وعریض اور عمیق سمندر موجزن ہے۔ جس کیلئے وہ مبارکباد کے مستحق ہیں اور میری مودبانہ گذارش ہوگی کہ وہ اسے منصۂ شہود پر ضرور لا کر دُنیائے ادب میں ایک بہترین اضافے کا موجب بنیں۔

رانا صاحب ایک مدت سے ادب کی خدمت میں کوشاں ہیں اپنے منعقد کردہ شاندار مشاعروں سے لے کر ویب سائٹ پر ''قندیل ادب'' جیسا شاہکار ادبی مجلہ ہر ماہ اپنے قارئین کے ذوقِ مطالعہ کی نذر کرتے ہیں جو دنیا کے بیشمار ممالک میں بڑے شوق و ذوق سے پڑھا جاتا ہے۔ مقامی اخبارات میں مسلسل کالم لکھتے ہیں۔ لندن اور گردونواح کی ادبی محفلوں میں بھی شرکت کرتے ہیں۔

اس کے علاوہ انہوں نے اپنے قلم کو اس قدر مصروف رکھا ہوا ہے کہ ان کے مزید چار پانچ مسودے اشاعت کے لئے تیار ہیں جو امید ہے منصۂ شہود پر آ کر دنیائے ادب و تاریخ میں گراں قدر اضافہ کریں گے اور پذیرائی حاصل کریں گے۔ آپ نہایت زود نویس قلمکار ہیں اور رات دن اسی کام میں مصروف رہتے ہیں۔ جو برطانیہ کی ادبی فضا کے لئے ایک خوشگوار جھونکے سے کم نہیں جس سے قارئین کو فرحت ملے۔

آپ ان لوگوں میں سے ہیں جو روشن ستارے کی مانند طلوع ہو کر دیکھتے ہی دیکھتے ادبی وصحافتی اُفق پر چھا جاتے ہیں اور اپنا مقام ہمیشہ قابل رشک رکھتے ہوئے ایک شجرِ سایہ دار کی طرح بے شمار لوگوں کو فیض یاب کرتے ہیں۔ ان کے ہاں ہر کیفیت میں شدت اور جذبے کی گہرائی دکھائی دیتی ہے۔ جس کے پسِ منظر میں ان کی بلند قامتی بخوبی نظر آتی ہے۔ ان کے ہاں جذبہ حب الوطنی اپنے عروج پر نظر آتا ہے۔ آپ وطن میں پھیلی ہوئی نفرتوں کی رِدا کو اُتار پھینکنا چاہتے ہیں اور مسلمانوں کو متحد دیکھنا چاہتے ہیں۔ اپنے طویل قد کاٹھ، پررُعب اور پرکشش شخصیت کے حامل ہوتے ہوئے بھی نہایت منکسر اور عاجزانہ رویہ کے مالک ہیں۔ میں نے کبھی انہیں غصے میں نہیں دیکھا چاہے ان کے ساتھ کیسی ہی ناانصافی ہوجائے جو کئی بار ہوتے بھی دیکھی ہے مگر یہ ایک ٹھنڈا سانس لے کر اسے برداشت کر کے چہرے پر مسکراہٹ لا کر اُونہہ کر کے ٹال جاتے ہیں جو آج کے دور میں بہت بڑے ظرف کی علامت ہے۔ رانا صاحب ایک مخلص دوست، ہر کسی کے ساتھ تعاون کو تیار، ادب نواز دوست نواز انسان ہیں جو آج کے دور میں خال خال نظر آتے ہیں۔ دوسروں کو عزت دینا اور ان کا دن منانا دوسروں کو آگے لانا انہیں فوقیت دینا ان کے خمیر میں شامل ہے۔ جو ایک فرشتہ صفت انسان کی پہچان ہے۔ میری دلی دعا ہے کہ اللہ پاک ان کے اس جذبہ صادق کو ہمیشہ قائم رکھے اور قبول فرما کر ان کی قلم میں برکت دے۔ آمین

-

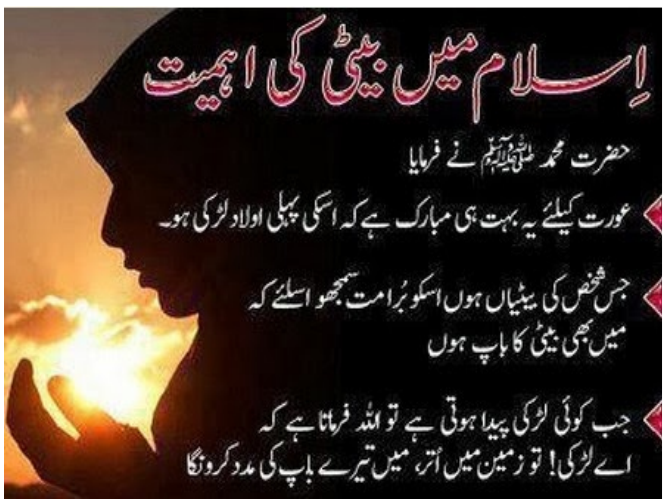

مسلمان دہشت گرد نہیں ہوسکتا

(مقصود احمد منیب ایم اے)

وَمَنْ يَّقْتُلْ مُؤْمِنًا مُتَعَمِّدًا فَجَزَآؤُهٗ جَهَنَّمُ خَالِدًا فِيْهَا وَ غَضِبَ اللّٰهُ وَلَعَنَهٗ وَاَعَدَّ لَهٗ عَذَابًا عَظِيْمًا۔

جو آیت میں نے شروع میں درج کی ہے اس کا معنیٰ یہ ہے کہ اور جو شخص کسی مومن کو دانستہ قتل کر دے تو اس کی سزا جہنم ہوگی۔ وہ اس میں دیر تک رہتا چلا جائے گا اور اللہ اس سے ناراض ہوگا اور اسے اپنی جناب سے دور کر دے گا اور اس کے لیے بہت بڑا عذاب تیار کرے گا۔ جب یہود و نصاریٰ میں یہ بحث چھڑ گئی کہ یہود کہتے صرف یہودی جنت میں جائیں گے دوسرے نہیں اور عیسائی کہتے کہ اگر جنت میں جانا چاہتے ہو تو عیسائی ہو جاؤ ورنہ جنت میں جانے کی کوئی اُمید نہیں وہاں اللہ تعالیٰ کیا فیصلہ فرماتا ہے؟ اللہ تعالیٰ سورہ بقرہ میں یہ بحث بیان کرنے کے بعد فرماتا ہے کہ بَلٰى مَنْ اَسْلَمَ وَجْهَهٗ لِلّٰهِ وَ هُوَ مُحْسِنٌ فَلَهٗ اَجْرُهٗ عِنْدَ رَبِّهٖ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ اور بتاؤ کہ دوسرے لوگ کیوں داخل نہیں ہوسکیں گے؟ جو بھی اپنے آپ کو اللہ کے سپرد کر دے اور وہ نیک کام کرنے والا بھی ہو تو اس کے رب کے ہاں اس کے لیے بدلہ مقرر ہے اور ان لوگوں کو نہ آئندہ کے متعلق کسی قسم کا کوئی خوف ہوگا اور نہ وہ کسی سابق نقصان پر غمگین ہوں گے۔

پس یہاں پر اللہ تعالیٰ جو جنتوں کا وارث ہے وہ یہ فیصلہ صادر فرما رہا ہے کہ جنت میں جانے کی اُمید وہ انسان رکھے جو سلامتی کا نہ صرف قائل ہو بلکہ احسان کرنے والا بھی ہو۔ اپنے آپ پر بھی اور دوسروں پر بھی رحم کرنے والا ہو۔ قرآن کریم نے کسی ایک مقام پر بھی کسی کو بلاوجہ قتل کرنے کی حمایت نہیں کی نہ ہی ترغیب دلائی ہے اور یہ بحث اللہ تعالیٰ نے یہود و نصاریٰ کی بیان فرمائی ہے کجا یہ کہ ایک شخص سچا عاشقِ رسول اور مسلمان بھی کہلائے اور جگہ جگہ فساد پھیلا کر دوسرے انسانوں بلکہ مسلمانوں کو جہاد کے نام پر قتل کرتا پھرے۔ حضرت اقدس محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک بار مسلمان کی تعریف کرتے ہوئے فرمایا کہ: اَلْمُسْلِمُ مَنْ سَلِمَ الْمُسْلِمُوْنَ مِنْ يَدِهٖ وَلِسَانِهٖ کہ مسلمان تو وہ ہے کہ جس کے ہاتھ اور زبان کے شر سے دوسرے مسلمان محفوظ رہیں۔ یہ بھی سچ ہے کہ کسی کو بھی کسی ایسے شخص کو کافر کہنے کا کوئی حق نہیں جو خود کو مسلمان کہتا ہو خواہ اس کے اعمال کیسے ہی کیوں نہ ہوں۔ ہاں یہ الگ بات ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کے بارہ قرآن کریم میں صاف طور پر فرما رہا ہے اور حضرت اقدس محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اس کے بارہ میں فیصلہ فرما دیا ہوا ہے کہ وہ شخص مسلمان نہیں ہوسکتا جس کے شر سے دوسرے لوگ بلکہ مسلمان بھی محفوظ نہیں۔ اس کی ایک مثال آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں یوں ملتی ہے کہ ایک شخص نے ایک بار بیان کیا کہ حضور ایک خاتون ہے جو نماز روزہ کی پابند ہے، حج بھی کیا ہے صدقہ بھی دیتی ہے لیکن اس کے ہمسائے اس سے بہت تنگ ہیں تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ وہ جہنمی ہے۔ اُسی مجلس میں ایک اور بُڑھیا کا ذکر ہوا کہ ایک بُڑھیا ہے جو نماز روزہ کی ایسی پابندی تو نہیں کرتی لیکن اس کے ہمسائے اس کے حسن سلوک کی بہت تعریف کرتے ہیں تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ وہ جنتی ہے۔ پس یہ وہ فیصلہ ہے جو اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کسی عام انسان کا فیصلہ نہیں کہ اپنی مرضی سے جس کو چاہا غیر مسلم قرار دے دیا جس کو چاہا واجب القتل قرار دے کر قتل کر دیا یا قتل کروا دیا۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں صاف طور پر فرما دیا ہے کہ کسی کو حق نہیں کہ کسی ایسے شخص کو غیر مسلم یا کافر کہے جو خود کو مسلمان یا مؤمن کہتا ہو۔

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ: وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَنْ اَلْقٰۤى اِلَيْكُمُ السَّلٰمَ لَسْتَ مُؤْمِنًا اور جو تمہیں سلام کہے اسے یہ نہ کہا کرو کہ تو مومن نہیں ہے۔ اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ کسی پر بھی مذہب کے معاملہ میں جبر نہیں ہے ہر کسی کی مرضی ہے کہ اپنی مرضی کے مطابق مذہب اختیار کرے اور پھر کہیں بھی رہتے ہوئے اپنی مذہبی تعلیمات کے مطابق زندگی گزارے لیکن حیرت انگیز بات ہے آج کے

نام نہاد علما اپنی مرضی کے مطابق کسی کو بھی مسلمان اور کسی کو بھی کافر کہہ دیتے ہیں اور اس کے خلاف فتویٰ صادر کر کے واجب القتل قرار دے دیتے ہیں اور مسلمانوں کو ایک دوسرے کے خلاف اُکساتے ہیں اور یوں مذہبی دہشت گردی کا بازار گرم ہو جاتا ہے۔ کہا یہ جاتا ہے کہ فلاں مذہب کے ماننے والوں کو قتل کر دو تو تمہیں جنت ملے گی اور حوریں تمہارا جنت میں استقبال کریں گی اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اپنے اہل و عیال کے ساتھ جنت کے دروازے پر تمہارے استقبال کے لیے کھڑے ہوں گے۔ اس طرح علما سرِ عام تعلیم دیتے دکھائی دیتے ہیں اور اس کے نتیجہ میں ملک میں فساد، بدامنی اور قتل و غارت گری کا بازار گرم ہو جاتا ہے اور کسی کی جان، مال اور عزت محفوظ نہیں رہتی جبکہ ایک مسلم ریاست میں امن اور سلامتی کا دور دورہ ہونا چاہیئے لیکن امرِ واقعہ یہ ہے کہ اسلامی ریاستیں ہی اس وقت دہشت کی علامت بنی ہوئی ہیں اور یہ مذہبی دہشت گرد کسی حکومت کے قابو میں نہیں آ رہے بلکہ کھلے عام جس کو چاہیں بموں اور گولیوں سے قتل کر دیں اور پھر خود کو خودکُش دھماکوں سے اُڑا کر ثبوت ہی غائب کر دیں کہ ان کا امام اور سرغنہ کون ہے؟

آج ضرورت ہے قوت برداشت کی، آج ضرورت ہے اسلام کی اصل تعلیم کی جس کی بنیادیں سلامتی پر اٹھی ہوئی ہیں، آج ضرورت ہے ضمیر اور مذہبی اختیار کی آزادی کی، آج ضرورت ہے ایک دوسرے کے وجود کو مٹانے کی بجائے تسلیم کرنے کی، آج ضرورت ہے خدائی فیصلے خدا کے ہاتھ میں تسلیم کرنے کی نہ کہ خدائی معاملات کو اپنے ہاتھ میں لینے کی۔ آج ضرورت ہے توحید باری تعالیٰ کو سمجھنے کی، آج ضرورت ہے توحید باری تعالیٰ کا جھنڈا دنیا میں لہرانے کی اور یہ کام صرف اور صرف وہی کر سکتا ہے جو اللہ تعالیٰ کو تمام قوتوں اور طاقتوں کا سرچشمہ نہ صرف تسلیم کرے بلکہ عملی طور پر اس کا ثبوت بھی دے اور یہ پرچم صرف اور صرف اسلام کے پاس ہے جس کے نام کا مطلب ہی سلامتی و آشتی ہے لیکن نام نہاد مسلمان علماء و عوام جو مرضی کرتے پھریں ان کے ہر ایک فعل کو اسلام کے ساتھ منسوب نہیں کیا جا سکتا یہ ان کے ذاتی اعمال ہیں۔

سارا فساد اسی بات کا تو ہے کہ انسان خدا کی جگہ لینا چاہتا ہے، کسی کے دلوں پر فتوے دینا اور پھر اس کی سزا مقرر کرنا اور اس پر عمل درآمد کروانا یہی آج کے انسان کی مرضی ہے۔ مطلق العنان بن کر ظالمانہ اور سفاکانہ فیصلے کر کے خود کو حق پر سمجھنا خدا کی خدائی میں دخل اندازی نہیں تو کیا ہے؟ گلیوں اور بازاروں میں کسی کے خلاف وعظ کرتے پھرنا اور فتوے بیچتے پھرنا کہ فلاں مسلمان ہے فلاں غیر مسلم، فلاں واجب القتل ہے اور فلاں نجات یافتہ وغیرہ وغیرہ۔ صرف اور صرف اپنے پیٹ کی خاطر ایک بھائی کو دوسرے بھائی کا گلا کاٹنے پر مجبور کر دینا تو اسلام نہیں ہے۔ انسانیت سوز حرکات کرنا اور دوسروں سے کروانا کہاں کا اسلام ہے؟ یہ کچھ بھی ہو وہ اسلام تو ہرگز نہیں جو حضرت اقدس محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم نے پیش فرمایا ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم تو رحمۃ اللعالمین بنا کر بھیجے گئے تھے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی رحمت میں سے ہر ایک نے حصہ لیا لیکن اس زمانہ کے مولویوں اور فتویٰ فروشوں نے حصہ نہیں لیا۔ اللہ تعالیٰ ان کی حالت زار پر رحم کرتے ہوئے اسلام کو ان کے ظلم و ستم سے بچائے۔ آمین۔ پس وہ شخص کیسے مسلمان ہو سکتا ہے جو دوسروں کو بلا وجہ قتل کرتا پھرے اور کوئی حقیقی مسلمان ایسا ظالم نہیں ہو سکتا کہ دوسرے مسلمانوں کو قتل کرتا پھرے لہٰذا یہ بات روزِ روشن کی طرح عیاں ہے کہ مسلمان دہشت گرد نہیں ہو سکتا اور نہ ہی کوئی دہشت گرد مسلمان ہو سکتا ہے؟

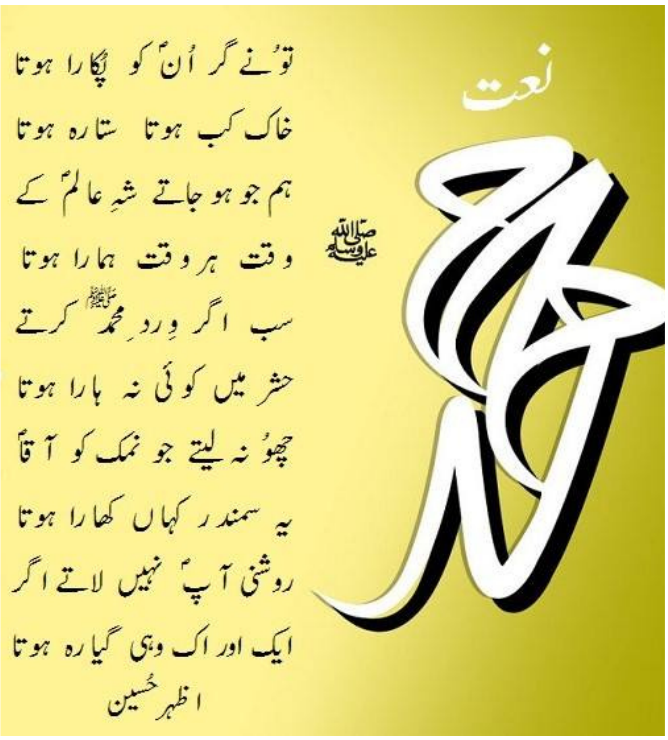

تنزانیہ (مشرقی افریقہ) کا یوم آزادی 9 دسمبر 1961

تنزانیہ نام کیسے اور کس نے رکھا؟

ڈاکٹر فضل الرحمان

تنزانیہ مشرقی افریقہ کا ایک اہم ملک ہے۔ پڑوسی ملکوں میں کینیا، یوگنڈا، کونگو، ملاوی، موزمبیق، زیمبیا اور برونڈی شامل ہیں۔ اس کا رقبہ 087,945 مربع کلومیٹر اور آبادی قریبا 5 کروڑ ہے۔ یہ ایک سیکولر ملک ہے۔ عیسائیوں اور مسلمانوں کا تناسب 60 اور 40 کا ہے۔ حکومت مذہبی معاملات میں مداخلت نہیں کرتی اور مذہبی منافرت پھیلانے کی کسی بھی کوشش کو سختی سے دبا دیتی ہے۔ کرنسی شلنگ ہے۔ بنیادی طور پر یہ ایک زرعی ملک ہے لیکن معدنیات یعنی سونے اور ہیروں کے بڑے ذخائر پائے جاتے ہیں۔ TANZANITE کا شمار دنیا کے بہترین اور قیمتی ہیروں میں ہوتا ہے۔ لوگ بہت سادہ ملنسار اور عزت کرنے والے ہیں۔ موسم معتدل ہے عموما درجہ حرارت کم سے کم 7 ڈگری اور زیادہ سے زیادہ 37 ڈگری سنٹی گریڈ تک جاتا ہے۔ زراعت کا انحصار بارش پر ہوتا ہے۔ تنزانیہ بحر ہند کے کنارے واقع ہے۔ سیاحوں کے لئے خاص کشش رکھتا ہے۔ افریقہ کا بلند ترین پہاڑ KILIMANJARO یہاں واقع ہے جس کی چوٹی 40 میٹر موٹے گلیشئر سے ڈھکی ہوئی ہے۔ دنیا کا دوسرا بڑا نیشنل پارک SERENGETI بھی یہاں پایا جاتا ہے جس میں شیر، ہاتھی زیبرے زرافے اور چیتے کثرت سے پائے جاتے ہیں۔ تین بڑی جھیلیں lake Victoria، lake Tanganyika اور lake Nyasa ہیں۔ مجموعی طور پر تنزانیہ ایک خوبصورت ملک ہے۔ تنزانیہ کا پرانا نام TANGANYIKA تھا۔ اس پر پہلے عربوں نے پھر پرتگالیوں، جرمنوں اور انگریزوں نے حکومت کی۔ اسے برطانوی حکومت سے آزادی 9 دسمبر 1961 میں ملی۔ اس سے قریب ایک مشہور جزیرہ ZANZIBAR ہے جو دارالسلام سے قریبا 22 میل کے سمندری سفر پر ہے۔ زنجبار کو آزادی 10 دسمبر 1963 کو ملی۔ 26 اپریل 1964 کو ٹانگانیکا اور زنجبار کا الحاق کر دیا گیا جو بالکل اسی طرح ہے جیسے پاکستان اور آزاد کشمیر کا ہے۔ تنزانیہ نام کیسے رکھا گیا۔ ٹانگانیکا اور زنجبار کے الحاق کے بعد اس نئے ملک کا نام رکھنے کا مسئلہ تھا۔ اس کے لئے حکومت نے انعامی مقابلے کا اعلان کیا۔ ایک احمدی طالب علم اقبال احمد ڈار جو اُس وقت سکول کے طالب علم تھے انہوں نے تنزانیہ نام تجویز کر کے یہ مقابلہ جیت لیا۔ اس پر انہیں انعامی رقم اور شیلڈ بھی دی گئی جو ان کے پاس اب بھی موجود ہے۔ یہ نام اس طرح تجویز کیا گیا۔

From TANGANYIKA... TAN

From ZANZIBAR ... ZAN

From IQBA ... i

From AHMAD ... A

محترم اقبال احمد ڈار صاحب آج کل برمنگھم انگلستان میں مقیم ہیں اللہ تعالی اُن کی عمر اور صحت میں برکت عطا فرمائے آمین۔ احمدیہ میڈیکل سنٹر موروگورو جس عمارت میں کام کر رہا ہے اور جہاں مجھے خدمت کی توفیق مل رہی ہے یہ عمارت اقبال ڈار صاحب کے والد محترم ڈاکٹر طفیل احمد ڈار صاحب نے جماعت کو تحفہ کے طور پر دی تھی۔ جماعت احمدیہ کی اس ملک میں رجسٹریشن 1934 میں ہوئی تھی۔ اس وقت تمام اضلاع میں مضبوط اور مخلص جماعتیں قائم ہیں۔ جماعت اس وقت روحانی میدان کے علاوہ طبی اور تعلیمی میدان میں بھی افریقن عوام کی خدمت کر رہی ہے۔ HUMANITY FIRST کے تحت WATER FOR LIFE کا کام بھی وسیع پیمانے پر کیا جا رہا ہے۔

افسانہ

ایش ٹرے

توصیف بریلوی
ریسرچ اسکالر، شعبۂ اردو۔
علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

جم (Gym) نے آخری بار ایک لمبی سانس چھوڑی اور اسٹیلا (Stella) کے برابر میں ہی ڈھیر ہو گیا۔ دونوں کافی دیر تک چھت کو دیکھتے رہے۔ سانسوں کی بازگشت دھیمی ہوئی۔ اسٹیلا نے اپنا نازک ہاتھ جم کے پیٹ پر پھیرتے ہوئے کہا ''دس سال پہلے جب ہم ٹین (Teen) تھے تب تمہارے Six Pack Abs ہوا کرتے تھے۔ تمہاری Physique بہت Attractive تھی لیکن اب تمہارا پیٹ نکل آیا ہے اور تم میں وہ Passion بھی نہیں رہا جس پر میں فدا تھی۔'' اسٹیلا کی بات سن کر جم کو غصہ آ گیا۔

اس نے اسٹیلا کا ہاتھ پکڑ کر جھٹکا اور تقریباً چلاتے ہوئے کہا ''بات تو تمہارے اندر بھی وہ نہیں رہی ہے جو پہلے ہوا کرتی تھی۔'' کہتے ہوئے جم کمرے کا دروازہ تیزی سے کھول کر باہر نکل گیا۔ آسمان صاف تھا۔ ڈوبتا ہوا سورج دھیرے دھیرے پگھل کر سمندر میں تحلیل ہوا جاتا تھا۔ لہریں اپنا سر چٹانوں سے پھوڑ رہی تھیں۔ دور جہاں پتھروں کا سلسلہ ختم ہوا تھا وہاں سیاح چہل قدمی کر رہے تھے۔ کوئی نہا رہا تھا تو کوئی کسی کے پیچھے ریت میں دوڑ رہا تھا۔ چٹان پر بیٹھا ہوا جم سگریٹ کے کش کھینچتے ہوئے لہروں پر نظریں مرکوز کئے ہوئے تھا۔ اسے اپنے شانے پر کچھ محسوس ہوا۔ مڑ کر دیکھا تو اسٹیلا کھڑی مسکرا رہی تھی۔ اس نے اپنی سفید بانہیں جم کے گلے میں ڈالتے ہوئے پیار سے کہا ''جم تمہیں کیا ہوا ہے.....؟ کیوں ایسا Behave کر رہے ہو.....؟ تمہیں تو معلوم ہے کہ میں ابھی چھبیس کی بھی نہیں ہوئی اور تم ہو کہ.....'' ''ہم ساتھ میں جوان ہوئے۔ اسکول میں ایک ساتھ کتنے مزے کئے۔ تمہیں یاد ہے نہ وہ دن جب تم نے اپنے ڈیڈ کی جیب سے روپئے چرا کر میرے تیرہویں برتھ ڈے پر پہلی بیئر (Beer) پلائی تھی اور شام کو انکل نے تمہارے کان کھینچے تھے۔ تمہارے موم ڈیڈ نے اپنے کام کی وجہ سے کئی شہروں میں رہائش اختیار کی اور اس طرح ہم جدا ہو گئے اور اب پورے دس سال بعد ملے۔ ہمیں ملے ہوئے کچھ ہی دن ہوئے ہیں۔ ابھی تو میں نے تمہیں جی بھر کے دیکھا بھی نہیں اور تمہارا مجھ سے جی بھر گیا.....'' کہتے ہوئے وہ روہانسی ہو گئی۔ جم ساری باتیں بے توجہی سے سن رہا تھا۔ اس کی سگریٹ کب کی ختم ہو چکی تھی۔ اس نے دوسری سگریٹ نکال کر ہونٹوں میں دبا لی۔ ''کیا تمہیں ان دس سال میں میری بالکل یاد نہیں آئی؟'' اسٹیلا نے خاموشی توڑی۔ ''تم ملے تو ایسا لگا کہ سب ٹھیک ہو گیا ہے لیکن میں غلط تھی۔'' ایک لمبی مدت کے بعد دونوں اتفاق سے ملے تھے لیکن کچھ ہی وقت تک تعلق خوشگوار رہ سکے۔ جم، اسٹیلا سے اس قدر بد دل ہوا کہ وہ اسے بے معنی لگنے لگی۔ وہ اس سے محظوظ نہیں ہو پا رہا تھا۔ پتہ نہیں اس کے دماغ میں کیا چل رہا تھا۔ حالانکہ شروع میں دونوں نے بڑی محبت سے چند دن گزارے لئے۔

اب وہ صبح سویرے اپنی دوکان پر پہنچ جاتا اور دور دراز سے آئے ہوئے سیلانیوں کو کاجو کی شراب بیچتا۔ یہ سمندر کے کنارے بسی ہوئی چھوٹی سی آبادی تھی پھر بھی یہاں کی خوبصورتی اور قدرتی مناظر سے لطف اندوز ہونے کے لیے سیلانی خوب آتے تھے۔ اسٹیلا اس کے لیے لنچ بنا کر لاتی تو وہ اکیلے ہی کھانے کے لیے بیٹھ جاتا۔ جم کی بے رخی دیکھ کر اسٹیلا دل ہی دل میں کڑھتی لیکن اس سے دور نہیں جانا چاہتی تھی۔ وہ اسے بہت چاہتی تھی۔ اس کے برعکس جم اس سے بہت کم بات کرنے لگا مگر اپنے گھر سے جانے کے لیے نہیں کہا۔ زندگی بس یوں ہی گزر رہی تھی۔ جم نے کبھی اسٹیلا کے گزشتہ احوال جاننے کی ضرورت نہیں سمجھی اور نہ ہی اپنے بارے میں زیادہ بتایا تھا۔ جبکہ اسٹیلا اپنے اوپر گزری ہر ایک واردات جم سے بانٹنا چاہتی تھی۔ صحیح وقت کے انتظار میں وہ اب تک کچھ نہیں بتا پائی تھی۔ ایک صبح جم باتھ روم سے ٹاول لپیٹے باہر آیا تو اسٹیلا نے آگے بڑھ کر تپاک سے اسے گلے لگاتے ہوئے برتھ ڈے وش کیا۔ جم نے بھی ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ اس کا شکریہ ادا کیا اور اسٹیلا سے الگ ہو گیا۔ جم

کو یہ جان کر خوشی ہوئی کہ اسٹیلا کو اس کا برتھ ڈے ابھی بھی یاد ہے لیکن اس نے خوشی کا اظہار نہیں کیا۔ شام کو جم گھر لوٹا کیک اور Red Wine دیکھ کر اور بھی خوش ہوا۔ وہ ماحول کو خراب نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اس لیے کیک کاٹا گیا اور دونوں نے ایک دوسرے کو کھلایا بھی۔ اس کے بعد شراب سے شوق فرمایا گیا۔ جام سے جام ٹکرائے تو دل بچوں کی مانند ہمکنے لگے۔ ''اسٹیلا.....تم بہت اچھی ہو۔ تمہیں میرا برتھ ڈے یاد رہا۔ میں نے اپنا آخری برتھ ڈے ڈیڈ کے ساتھ سیلی بریٹ کیا تھا۔ ان کے گزرنے کے بعد اب تک نہیں منایا بلکہ مجھے تو یاد بھی نہیں تھا۔'' جم کی زبان فرط جذبات لڑکھڑا رہی تھی۔ ان چند دنوں میں جم نے اسٹیلا کو یہی بتایا تھا کہ اس کے ماں باپ گزر چکے ہیں۔ آج اس نے بتایا کہ ''ڈیڈ کے گزر جانے کے بعد موم کسی کے ساتھ چلی گئی۔'' اتنا کہہ کر وہ بچوں کی طرح رونے لگا۔ اسٹیلا نے فوراً اسے اپنے سینے سے لگا لیا اور اس کے بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے اسے تسلیاں دینے لگی۔ میں ہوں نہ.....ہم م م م! سب ٹھیک ہو جائیگا۔ تم فکر نہ کرو میں تمہارا خیال رکھوں گی۔ جم نے خود کو اسٹیلا کی بانہوں میں ڈھیلا چھوڑ دیا۔ وہ سکون محسوس کر رہا تھا۔

اچھا چلو اب کھانا کھاتے ہیں میں نے تمہاری پسند کا Stew بنایا ہے۔ تمہیں پسند ہے نہ.....کہتے ہوئے اسٹیلا اس سے الگ ہو گئی۔ رات آدھی گزر چکی تھی۔ بستر پر دونوں اپنے ماضی کے قصے دوہرا رہے تھے۔ بیچ بیچ میں دونوں اپنے بچپن کی شرارتوں کو یاد کر کے زور سے ہنس پڑتے۔ قہقہے تھے اور خاموشی چھانے لگی۔ کمرے کی مدھم روشنی میں دونوں سنجیدگی سے ایک دوسرے کو دیکھ رہے تھے۔ خاموشی اور بھی خاموش ہونے لگی تب جم نے اسٹیلا سے اس کے بارے میں جاننا چاہا۔ اسٹیلا تو جیسے اپنا بوجھ ہلکا کرنے کی در پہ تھی۔ اس نے بتانا شروع کیا.....موم تو بچپن میں ہی گزر گئی تھیں یہ تو تم جانتے ہی ہو کچھ سال بعد ڈیڈ کی بیماری بڑھی انھیں ایک ایک سانس مشکل ہو گئی اور وہ بھی مجھے اکیلا چھوڑ گئے۔ ایک دن میری دور کی آنٹ گھر پر آئیں۔ انھوں نے مجھے گھر بیچنے پر اُکسایا اور اپنے ساتھ لے جانے کے لیے کہا۔ شروع میں تو میں نے منع کیا لیکن دھیرے دھیرے میں بھی مان گئی۔ اکیلے رہنے کے بجائے ان کے ساتھ رہنا ٹھیک سمجھ رہی تھی۔ مجھے ان کی جھوٹی شفقت کا علم تب ہوا جب میں ان کے گھر جا کر ان کے بچوں کی آیا بن کر رہ گئی تھی۔ میرے گھر کو بیچ کر جو رقم ملی تھی وہ انھوں نے ضبط کر لی۔ اب میں گھر کی رہی تھی نہ گھاٹ کی۔ ڈیڈ کی موت کے بعد ان کی شیلف سے موم کا ایک نیکلس اور برسلیٹ ملا تھا۔ جس کے بارے میں میں نے آنٹ کو کچھ نہیں بتایا۔ کاش نیکلیس اور برسلیٹ پہلے ہی مل جاتے تو شاید ڈیڈ کا علاج ٹھیک سے ہو جاتا۔ ایک دن آنٹ کے گھر سے بھاگ نکلی اور پھر.....اتنا کہہ کر اسٹیلا خاموش ہو گئی۔ اور پھر کیا ہوا.....؟ جم نے سنجیدگی سے پوچھا۔ اسٹیلا کی سانسیں بے ترتیب ہوئیں، آنکھیں دھندلانے لگیں اور پھر یکا یک کچھ سوٹیڈ بوٹیڈ ہیولے اس کے سامنے پھرنے لگے۔ ان میں سے کسی کی بھی شکل ٹھیک سے دکھائی نہیں دے رہی تھی جس سے ان کی شناخت ہو سکے۔ وہ سب سگریٹ پی رہے تھے۔

ان کی سگریٹس (Cigarettes) سلگنے کی بجائے لپٹیں چھوڑ رہی تھیں۔ ان میں اپنی سگریٹ پہلے بجھانے کے لیے ہوڑ لگی ہوئی تھی۔ باری باری سے وہ اپنی سگریٹ کو ایک نہایت خوبصورت اور نازک ایش ٹرے میں بجھا رہے تھے۔ بعض اوقات ایسا بھی ہوتا کہ دو سگریٹ ایک ساتھ ایش ٹرے میں ڈال کر بجھانے کی کوشش کی جاتی۔ جم نے پھر کہا.....اسٹیلا.....! خاموش کیوں ہو بتاتی کیوں نہیں؟ جم کی آواز اب سنجیدہ نہیں رہی تھی۔ جم.....! ہم اتنے سال بعد ملے ہیں۔ میں تمہیں کوئی بات بتا کر دکھ نہیں دینا چاہتی۔ میں در بدر پھرتی رہی ہوں لیکن اب تمہارے ساتھ ہی زندگی گزارنا چاہتی ہوں۔ میری زندگی کے یہ دس سال مجھ پر بہت سخت گزرے ہیں۔ اسٹیلا عاجزی سے کہے جا رہی تھی اور غیر شعوری طور پر اس کا ہاتھ جم کے چہرے پر تھا۔ جم کے چہرے کے تاثرات ایک بار پھر بدل گئے تھے لیکن کسی طرح خود کو ضبط کئے ہوئے تھا۔ اب وہ مزید کچھ سننا بھی نہیں چاہتا تھا اس لیے اس نے اسٹیلا کی طرف سے کروٹ لے لی۔ اسٹیلا بھی دم بخود پڑی رہی اس نے خاموشی میں ہی عافیت جانی۔ جم.....! ناشتہ تو کر لو۔ مجھے کچھ نہیں چاہئے۔ مجھے تمہارے وجود سے بھی نفرت ہو رہی ہے۔ تمہیں کیا لگا تم اگر نہیں بتاؤ گی تو مجھے پتہ نہیں چلے گا۔ میں سب سمجھتا ہوں۔ ضرور تم اتنے سال تک کہیں عیش کرتی رہی ہو گی۔ You are a floozy.....جم نے گرجتے

ہوئے حقارت آمیز لہجہ استعمال کیا۔کیا کہا تھا تم نے میرے اندر Passion باقی نہیں رہا اور تمہارے اندر.....؟تم تو کھوکھلی ہو چکی ہو۔تم وہ اسٹیلا نہیں ہو جو دس سال پہلے مجھ سے جدا ہوئی تھی۔تم کسی کو خوش رکھنے کے لائق نہیں ہو بلکہ تم اب ضرورت کا سامان بھی نہیں رہی ہو۔تمہاری مارکیٹ ویلیو ختم ہو چکی ہوگی اور اسلیئے تم اپنا جھوٹا پیار جتاتے ہوئے میرے پاس آ گئی ہو۔

آخر اس سے پہلے تم نے مجھے کیوں نہیں ڈھونڈا.....؟تمہاری محبت نے اتنی دیر بعد کیوں جوش مارا؟میں تمہارے ساتھ نہیں رہ سکتا۔جم کی آواز پھٹ رہی تھی اور اسٹیلا کی کہیں اندر ہی دفن ہوگئی تھی۔اس کی نیلی آنکھیں اور گلابی گال گیلے ہو رہے تھے۔ہمت کر کے اس نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا.....ہاں،میں حالات کا شکار ہوئی ہوں۔میرے دل میں تمہارے لیے کتنی محبت ہے،یہ میں تمہیں نہیں سمجھا سکتی۔میں نے کوئی کام اپنی مرضی سے نہیں کیا ہے۔بس اتنا کہوں گی.....تمہارے بغیر میں بہت تڑپی ہوں اور اب بھی تمہیں بہت محبت کرتی ہوں ہم پھر ملیں گے۔اسٹیلا نے جذباتی ہوتے ہوئے کہا اور جم نے منہ پھیر لیا۔ٹرین پٹریوں پر دوڑی چلی جا رہی تھی۔اسٹیلا کھڑکی کے ساتھ والی سیٹ پر بیٹھی ہوئی میگزین پڑھ رہی تھی۔اس کی آنکھوں پر مہنگا گاگل تو تھا لیکن گلے سے نیکلیس اور ہاتھ سے برسلیٹ غائب تھے۔اسٹیلا کے ہاتھ سے میگزین چھوٹ کر اس کے پیروں پر آ گرا۔میگزین کا جو ورق اوپر تھا اس کی ہیڈنگ تھی.....Reverginity Surgery۔

ڈاکٹر منور احمد کنڈے،ٹیلفورڈ،انگلینڈ

سینے میں اُلفتوں کا خزانہ پڑا ہے بند
اشکوں کا چشمِ عبد میں دریا پڑا ہے بند
مفلس نے خط جو لکھا تھا اک التجا بھرا
حاکم کی میز پر وہ لفافہ پڑا ہے بند
نورِ یقین کس طرح اُترے گا مہر و ماہ !
دل کے مکان کا تو دریچہ پڑا ہے بند
سارے ہی راز درد کے مدفون ہیں جہاں
کیونکر وہ فکر و جذب کا کمرہ پڑا ہے بند !!
سجدوں سے اس کے ماتھے پہ محراب ہے بنی
دیتی نہیں دکھائی وہ چہرہ پڑا ہے بند
اک بے خطا کے خواب منوّر ہیں شب بہ شب
قیدی ہے اک ضمیر کا تنہا پڑا ہے بند

طاہرہ زرتشت نازناروے

ایک زمانہ بیت گیا

دیس پرائے دل کو لگائے ایک زمانہ بیت گیا
اپنے وطن کو چھوڑ کے آئے ایک زمانہ بیت گیا
نیناں ہر پل نیر بہائے ہوک سی دل میں اُٹھتی ہے
دل میں ہجر کا داغ چھپائے ایک زمانہ بیت گیا
دل نے کیا کیا زخم ہیں کھائے ان انجانی راہوں میں
تم کو دل کا حال سنائے ایک زمانہ بیت گیا
بیری جگ کی جیت ہوئی ہم سچے ہو کر ہار گئے
منصف کو روداد سنائے ایک زمانہ بیت گیا
دیس کی سندر ماٹی من میں آج بھی پھول کھلائے ہے
ان پھولوں کے ہار پروئے ایک زمانہ بیت گیا
حق کی راہ اپنانے پرہم ملزم اور مقہور ہوئے
شیخ کو کفر کی مہر لگائے ایک زمانہ بیت گیا
کب باجے گی چین کی بنسی کب پنچھی گھر آئیں گے
کل پرسوں کی آگ لگائے ایک زمانہ بیت گیا
دھرتی پنج دریاؤں کی دیکھو کیسی بے آب ہوئی
رحم کا مینہ برسے برسائے ایک زمانہ بیت گیا
حق کے پجاری رہ نہ سکیں اس دیس کا اب دستور ہوا
عدل کی ہر تحریر مٹائے ایک زمانہ بیت گیا
ہر ظالم اور جابر کی قسمت میں لکھی رُسوائی ہے
حاکم کو یہ حکم سنائے ایک زمانہ بیت گیا
سکھیاں بھی مل کر گائیں گی اور کرشنا بھی گھر آئیں گے
گوپی کے گھر کرشنا آئے ایک زمانہ بیت گیا

پاکستانی طیاروں کو پیش آنے والے 16 بڑے حادثات

عاصی صحرائی

قیام پاکستان کے بعد سے اب تک پاکستان اور اس سے باہر قومی اور مقامی ایئر لائنز کو 16 ایسے بڑے حادثات پیش آئے جن میں سینکڑوں قیمتی انسانی جانوں کا ضیاع ہوا۔

پاکستان ایئر لائن کے طیارہ بوئنگ 707، 20 مئی 1965 کو مصر کے لئے اپنی پہلی ہی پرواز پر حادثے کا شکار ہوا جس میں سوار تمام 124 مسافر جاں بحق ہوئے جس کے بعد 6 اگست 1970 کو پی آئی اے کا ہی فوکر طیارہ ایف 27 اسلام آباد ایئر پورٹ سے پرواز بھرنے کے فوراً بعد ہی زمین پر آ گرا جس میں سوار تمام 30 افراد جاں بحق ہو گئے۔ 8 دسمبر 1972 کو پی آئی اے کا ہی فوکر طیارہ ایف 27 راولپنڈی میں حادثے کا شکار ہوا جس میں سوار تمام 26 افراد جاں بحق ہوئے جس کے بعد چوتھا بڑا حادثہ 26 نومبر 1979 میں اس وقت پیش آیا جب پی آئی اے کا بوئنگ 707 طیارہ حاجیوں کو لے کر اسلام آباد آ رہا تھا اور جدہ ایئر پورٹ سے اُڑان بھری ہی تھی کہ زمین پر آ گرا جس میں سوار تمام 156 حاجی جاں بحق ہوئے۔ اکتوبر 1986 کو پی آئی اے کا فوکر ایف 27 پشاور میں لینڈ کرتے ہوئے حادثے کا شکار ہوا جس میں سوار 54 افراد میں سے 13 جاں بحق ہوئے جب کہ 17 اگست 1988 کو پاک فوج کا امریکی ساختہ ہرکولیس سی 130 طیارہ بہاولپور کے قریب گر کر تباہ ہوا جس میں اس وقت کے صدر اور آرمی چیف جنرل ضیاالحق سمیت 30 عسکری حکام جاں بحق ہوئے اور ان میں ایک امریکی سفیر بھی شامل تھے۔ 25 اگست 1989 کو گلگت بلتستان سے پرواز بھرنے والا پی آئی اے کا فوکر طیارہ اچانک لاپتہ ہو گیا جس کا آج تک کچھ علم نہیں جب کہ طیارے میں 54 مسافر سوار تھے۔ 28 ستمبر 1992 کو پی آئی اے کی ایئر بس اے 300 نیپال کے کھٹمنڈو ایئر پورٹ کے قریب پہاڑیوں سے ٹکرا گیا تھا جس میں سوار تمام 167 مسافر جاں بحق ہوئے تھے۔ اسی طرح 19 فروری 2003 کو ایئر فورس کا فوکر ایف 27 کوہاٹ میں گر کر تباہ ہوا جس میں سوار ایئر چیف مارشل مصحف علی میر اور ان کی اہلیہ سمیت 15 افراد جاں بحق ہوئے۔ 24 فروری 2003 کو چارٹر طیارہ سیسنا 402 بی کراچی کے قریب سمندر میں گر کر تباہ ہوا جس میں سوار افغانستان کے وزیر معدنیات جمعہ محمد محمدی، 4 افغان حکام، چینی ماہر اور دو پاکستانی جاں بحق ہو گئے تھے۔ 10 جولائی 2006 کو ملتان سے پرواز بھرنے والا پی آئی اے کا فوکر ایف 27 طیارہ لاہور کے قریب کھیتوں میں گر کر تباہ ہوا جس میں سوار تمام 41 مسافر اور عملے کے 4 افراد جاں بحق ہوئے۔ فضائی حادثات کے اعتبار سے سال 2010 بدترین سال ثابت ہوا جس میں تین بڑے حادثات رُونما ہوئے جب کہ صرف نومبر کے مہینے میں ہی 2 بڑے حادثات واقع ہوئے۔

28 جولائی 2010 کو ایئر بلو کی ایئر بس 321 طیارہ اسلام آباد ایئر پورٹ پر لینڈنگ سے قبل مارگلہ پہاڑیوں سے ٹکرا کر تباہ ہوا جس میں سوار تمام 152 مسافر جاں بحق ہوئے جس کے بعد اسی سال 5 نومبر کو کراچی ایئر پورٹ سے پرواز بھرنے والا چارٹر طیارہ گر کر تباہ ہوا جس میں سوار اٹلی کی آئل کمپنی کے اسٹاف سمیت 21 مسافر ہلاک ہوئے جب کہ 28 نومبر کو روسی ساختہ الیوشن آئی ایل 76 کارگو طیارے نے کراچی ایئر پورٹ سے اُڑان بھری ہی تھی کہ اس کے انجن میں آگ لگ گئی جس کے نتیجے میں جہاز مکمل طور پر تباہ ہو گیا اور اس میں سوار تمام 12 افراد ہلاک ہوئے۔ 20/اپریل 2012 کو بھوجا ایئر لائن کا طیارہ 737 خراب موسم کے باعث اسلام آباد میں گر کر تباہ ہوا جس میں سوار تمام 130 مسافر جاں بحق ہوئے جب کہ 8 مئی 2015 کو پاک فوج کا ہیلی کاپٹر غیر ملکیوں کو لے کر گلگت بلوچستان جا رہا تھا کہ نلتر کے مقام پر گر کر تباہ ہوا جس میں سوار 8 افراد ہلاک ہو گئے جب کہ مرنے والوں میں ناروے، فلپائن اور انڈونیشیا کے سفیر اور ان کی ازدواج سمیت ملائیشیا اور انڈونیشیا کے سفیر شامل تھے۔ اب یہ پی 661 طیارہ جو سوات سے اسلام آباد 41 افراد کو 7 دسمبر لے جا رہا تھا۔ حویلیاں کے مقام پر گر کر تباہ ہو گیا۔

-

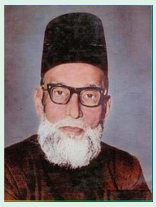

شیخ محمد اسماعیل پانی پتی

مرسلہ:
زکریا ورک کینیڈا

شیخ محمد اسماعیل پانی پتی میرے بہت پرانے دوست ہیں۔ ان سے میری پہلی ملاقات آج سے 33 سال پیشتر حالی مسلم ہائی سکول پانی پت کے کتب خانے میں ہوئی تھی۔ میں نے دیکھا کہ کتب خانے کی بڑی میز کے پاس ایک نہایت سنجیدہ جوان گہرے مطالعہ میں مصروف ہے۔ اور بار بار ایک کاغذ پر کچھ یادداشت لکھ رہا ہے۔ چھریرا جسم، ستاہوا چہرہ، سیاہ داڑھی، سر کے بال باریک کٹے ہوئے، بدن پر ایک صاف مگر سادہ کرتا اور شرعی پاجامہ۔ یہ تھے شیخ محمد اسماعیل۔ ان کی شخصیت میں جو چیز میرے نزدیک سب سے زیادہ جاذب تھی وہ ان کا خلوص تھا۔ ان کی حق گوئی، راست بازی، اور نیک نیتی تھی۔ شیخ صاحب کی شخصیت کی سب سے بڑی کمزوری یہ ہے کہ اس میں تنوع اور رنگارنگی نہیں ہے۔ ان کو نہ تو انواع و اقسام کے لذیذ کھانوں کا شوق ہے نہ ان کو بہت عمدہ قسم کے لباس سے شغف ہے اور نہ کھیل تماشوں، میلوں اور دوسری تفریحات کی طرف میلان۔ انہوں نے غالباً عمر بھر سینما نہیں دیکھا۔ اور کسی قسم کا کھیل نہیں کھیلا۔ عملی سیاست سے بھی وہ ہمیشہ علیحدہ رہے۔ ان سب چیزوں کو چھوڑ کر ان کو ایک اور صرف ایک چیز کا عشق ہے وہ ہے کتاب، مطالعہ، عملی تحقیق اور تصنیف و تالیف۔ ہم نے مطالعہ کے شوقین بہت دیکھے ہیں مگر اس لحاظ سے شیخ محمد اسماعیل صاحب دھج نرالی ہے۔ اپنے لڑکپن کا ذکر شیخ صاحب نے بارہا کیا ہے۔ خود ان کے قول کے مطابق وہ اس زمانے میں رات کو دو ڈھائی بجے تک کتاب پڑھتے رہتے تھے۔ والدین کی تاکید تھی کہ رات کو جلد سو جائیں ان کے لحاظ سے منھ لحاف میں ڈھک لیتے اور لحاف کے اندر سرسوں کے تیل کا چراغ جلا کر ہمارے شیخ صاحب پڑھتے رہتے۔ گھر والے سمجھتے کہ سو رہے ہیں۔ شیخ صاحب نے ہمیشہ اپنی آمدنی کا بیشتر حصہ کتابیں خریدنے پر صرف کیا اور ہمیشہ اچھی کتاب کی تلاش میں رہتے تھے۔ اس طرح انہوں نے ایک بے نظیر ذاتی کتب خانہ جمع کر لیا تھا۔ جو بیش قیمت قلمی نسخوں اور نایاب مطبوعہ کتابوں پر مشتمل تھا۔ جس خوش اسلوبی سے شیخ صاحب اس کو استعمال کرتے تھے بہت کم لوگ ذاتی کتب خانوں سے ایسا استفادہ کر سکتے ہیں۔ اکثر شائقین علم اس کتاب خانے کو دیکھنے کیلئے دور دور سے آتے تھے۔ یہ کتب خانہ شیخ صاحب کی زندگی بھر کا عزیز ترین اور نہایت قیمتی سرمایہ تھا۔ افسوس ہے کہ یہ 1947ء کے انقلابات کی نذر ہو گیا۔ شیخ صاحب کی صحت پر اس کے ضائع ہونے کا بہت برا اثر پڑا تھا۔ بالعموم دیکھا گیا ہے کہ ذاتی کتب خانوں کے مالک اپنی کتابوں کی ہوا بھی کسی کو لگنے نہیں دیتے مگر شیخ صاحب اس معاملہ میں بہت فیاض رہے ہیں۔ ان کے کتب خانے سے ہر شخص فائدہ اٹھا سکتا تھا۔ شیخ صاحب کی یادداشت نہایت عمدہ ہے۔ بعض اوقات ان کی اس خوبی سے عجیب لطیفے رونما ہوئے۔ 1934ء میں سید محی الدین صاحب پرنسپل عثمانیہ انٹرمیڈیٹ کالج اورنگ آباد نے اپنے کالج میں حالی کی صد سالہ جشن ولادت بڑے شان سے منائی تھی۔ شیخ صاحب اور میں حالی مسلم ہائی سکول پانی پت کے نمائندوں کی حیثیت سے وہاں مدعو تھے۔ مسٹر اکبر حیدری وزیر اعظم (ریاست حیدر آباد) جلسہ کی صدارت کر رہے تھے۔ بابائے اردو ڈاکٹر عبدالحق مولانا حالی پر تقریر کر رہے تھے۔ تقریر کے دوران دفعتاً مولوی صاحب نے شیخ صاحب سے سوال کیا کہ مجالس النساء مولانا حالی نے کس سنہ میں تحریر کی تھی۔ شیخ صاحب اس وقت کچھ لکھ رہے تھے۔ مگر بلا تامل انہوں نے سوال کا جواب دیا اور پھر اپنے کام میں مصروف ہو گئے۔ تمام حاضرین جلسہ کی نظریں شیخ صاحب پر پڑیں اور لوگ حیرت زدہ ہو کر ایک دوسرے کو پوچھنے لگے کہ یہ کون بزرگ ہیں جو حالی کے متعلق ایسا یقینی علم رکھتے ہیں کہ مولوی عبدالحق بھی استفسار فرماتے ہیں اور بھروسا کرتے ہیں اور جن کو حالی کی لائف کے جزئیات گویا ازبر ہیں۔ حقیقت بھی یہی ہے کہ حالی کی تحقیق پر شیخ صاحب نے ساری عمر جس قدر کاوش و کوشش کی ہے کسی دوسرے کو میسر نہیں۔ انہوں نے اس موضوع پر اس قدر مواد جمع کیا ہے کہ اگر وہ لکھیں تو بہت آسانی سے ہزار صفحہ کی سوانح عمری لکھی جا سکتی ہے۔ لائف لکھنے کی آرزو تو اب بھی پوری نہ ہو سکی مگر شیخ صاحب نے مولانا حالی کے

غیر مطبوعہ کلام اور کلیات کے کئی مجموعے مرتب کئے جن کو انجمن ترقی اردو نے شائع کیا تھا۔ ایک مختصر سوانح حیات تذکرہ حالی کے نام سے لکھی اور بکثرت مضامین مختلف رسائل کیلئے لکھے۔ شیخ صاحب نے ہندوستان کے مؤقر رسائل و جرائد میں مضامین لکھنے کا سلسلہ پندرہ سال کی عمر سے شروع کیا اور اب تک جاری ہے۔ ان کی تعداد بتانا مشکل ہے لیکن بعض تحقیقی مقالے واقعی تحسین و آفرین ہیں۔ اس لحاظ سے شیخ صاحب کی ایک قابل ذکر خوبی یہ بھی ہے کہ ان مضامین پر تحقیق کا کام آپ نے دس پندرہ سال تک کیا۔ یہ استقلال حیرت انگیز ہے ایسا ہی ایک مقالہ سنسکرت کے عربی و فارسی تراجم ہے جس کو شیخ صاحب نے سالہا سال کی محنت شاقہ کے بعد مرتب کیا۔ مولانا وحید الدین سلیم پروفیسر عثمانیہ یو نیورسٹی فرمایا کرتے تھے کہ اس مضمون کو دیکھ کر میں فخر کرتا ہوں کہ میرے اہل وطن میں ایسا فاضل محقق موجود ہے۔ میں نے بھی اس مقالے کا اس وقت انگریزی میں ترجمہ کیا تھا۔

شیخ صاحب کو میں نے کبھی کسی بڑی سے بڑی شخصیت سے مرعوب ہوتے نہیں دیکھا۔ ذاتی تمتع کے خاطر وہ کبھی بھی کسی کی خوشامد نہیں کرتے۔ جن بڑے لوگوں سے ان کا ملنا رہا وہ برابر کے درجے میں رہا۔ اپنی رائے کے اظہار میں ان کو ہمیشہ بے باک پایا مگر اس کے ساتھ وہ دوسروں کی رائے کی قدر کرنا بھی جانتے تھے۔ وہ بے حد خلیق، اور ملنسار انسان ہیں۔ شیخی، ریاکاری، تصنع سے ان کو دور کا واسطہ نہیں۔ دوستوں کے مخلص اور ہمدرد دوست تھے۔ اعزہ و اقارب کے ساتھ ان کا سلوک ایسا ہے کہ ان کی شکایت کسی سے سننے میں نہیں آئی یہ بڑی بات ہے۔ ان کی صحبت کا رنگ خالص علمی ہوتا ہے۔ اس کے باوجود ان کی گفتگو بہت دل چسپ ہوتی ہے مجھے پانی پت میں سالہا سال تک ان کی گفتگو سے لطف اندوز ہونے کا موقع ملا۔ ایک عرصے تک یہ معمول رہا کہ ہم دونوں علی الصبح سیر کیلئے جاتے اور دو گھنٹے تک علمی باتوں پر گفتگو کرتے رہتے۔ یہ لطف میں عمر بھر نہیں بھول سکتا اور اب بھی یہ تمنا دل میں موجود ہے کہ کاش وہ زمانہ پھر لوٹ آئے۔ شیخ صاحب غالباً 1893 میں دہلی کے قریب ایک گاؤں پالی میں پیدا ہوئے تھے۔ زندگی کا بیشتر حصہ اپنے اسی آبائی مکان واقع پانی پت میں بسر کیا۔ مکان محلہ انصار میں اس مکان کے پشت پر تھا جس میں الطاب حسین حالی پیدا ہوئے تھے۔ نیچے کے مکان میں وہ اپنے اہل وعیال کے ساتھ رہتے تھے۔ اوپر کی منزل شیخ صاحب کا کتب خانہ تھا۔ دن بھر اسی جگہ بیٹھے تصنیف و تالیف و تحقیق کے دل پسند مشغلہ میں محو رہتے تھے۔ بچپن دہلی میں گزرا جہاں ان کے والد بسلسلہ کاروبار رہا کرتے تھے۔ عنفوان شباب میں پانی پت لوٹ آئے۔ کچھ عرصہ تک حالی مسلم ہائی اسکول کے کتب خانے کے لائبریرین رہے۔ اسی زمانے میں یہ بھوپال اور پھر حیدرآباد پہنچے۔ ۱۹۳۴ میں ان کا انتخاب ہفت روزہ عروج کے ایڈیٹر کی حیثیت میں ہوا جو ضلع جھنگ کا سرکاری اخبار تھا۔ مگر وطن کی محبت نے کچھ ایسا مجبور کیا کہ ڈھائی سال بعد ہی استعفیٰ دے کر پانی پت واپس آ گئے۔ دو سال تک پیغام حیات کے نام سے ہفت روزہ اخبار نکالتے رہے لیکن وجوہ سے اس کو بھی بند کرنا پڑا۔ 1947 سے وہ مسلسل لاہور میں مقیم تھے اور ان کا محبوب مشغلہ تالیف و تصنیف برابر جاری تھا۔ ان کی تصانیف کی تعداد اس قدر ہے کہ ان سب کا ذکر طوالت سے خالی نہیں۔ شیخ صاحب اگرچہ بہت سنجیدہ آدمی ہیں لیکن ان کی طبیعت میں برجستہ مزاج کی بھی عمدہ صلاحیت ہے۔ ایک بار ان کے ایک بے تکلف دوست اپنے جوان بیٹے کی شکایت کرنے لگے۔ ان کے دوست کا نام محمد نوح تھا۔ شیخ صاحب نے ہمدردی کرتے ہوئے کہا: کیا کیا جائے آخر پسر نوح ہے۔ بعض لوگوں کی عادت ہوتی ہے کہ کسی دوسرے سے ملنے جاتے ہیں تو میز کے قریب بیٹھ کر میز کی چیزوں مثلاً پن کشن، پیپر ویٹ وغیرہ سے کھیلتے رہتے ہیں یا میز پر رکھے خطوط ہی پڑھنے لگتے ہیں جو ایک قسم کی بدتہذیبی ہے۔

ایک دفعہ شیخ صاحب بھی ایک ایسے ہی شخص کے ہاتھوں تنگ آ گئے اخلاق مانع تھا کہ ان کو سختی سے روک دیں۔ اس موقع پر شیخ صاحب نے جو طریقہ اختیار کیا وہ بہت خوب تھا۔ وہ حضرت حسب عادت پھر آئے اور اپنا کام شروع ہی کیا تھا کہ شیخ صاحب نے میز کی دراز سے ایک خوبصورت گڑیا نکال کر ان کے آگے رکھدی۔ لیجئے اس سے شوق فرمائے۔ دوسرے لوگ بے حد محظوظ ہوئے اور وہ خود ایسے بھاگے کہ پھر نہ لوٹے۔ میں نے شروع میں لکھا ہے کہ شیخ صاحب کی طبیعت میں رنگا رنگی نہیں ہے اس کے باوجود اچھے افسانے لکھنے میں کامیاب ہیں اس کی غالباً وجہ یہ ہے کہ ان کے افسانوں کے کردار بالعموم تاریخی ہوتے ہیں۔

-

تلور کی کہانی۔ پاکستانی مسلمانوں کی دلالی

(بشکریہ محمد وجاہت)

ایک دن ایک C5 گلیکسی طیارہ اونٹ، خادموں، شکروں، گاڑیوں اور دستی ہتھیاروں سے بھرا ہوا رحیم یار خان ائیر پورٹ پر لینڈ کرتا ہے تو شاہی محل سے لے کر ائیر پورٹ تک کا سارا علاقہ وہاں کے مقامی لوگوں کے لئے سختی سے ممنوع کر دیا جاتا ہے۔ سامان آرائش اور دیگر سامان ضرورت جب ترتیب پا جاتا ہے تو Gulf Stream پرائیویٹ بزنس جیٹ طیاروں کا ایک غول آتا ہے جن میں سے شاہی شہزادے نمودار ہو کر مہنگی ترین گاڑیوں میں بیٹھ کر ہتھیاروں سے لیس محافظوں کے ساتھ اپنے محل میں روانہ ہو جاتے ہیں۔ ایک سے ڈیڑھ ہفتہ کے اس دورانیہ میں مشائخ کا بنیادی مشغلہ تلور کا شکار ہوتا ہے۔ یہ کھیل عام طور پر بعد از دوپہر شروع ہوتا ہے۔ اس میں شکرے، کتے، اونٹ، گھوڑے اور 4x4 گاڑیاں استعمال ہوتی ہیں۔ آذان مغرب کے قریب شکار ختم ہو جاتا ہے۔ پھر مغرب کی باجماعت نماز ادا کی جاتی ہے۔

اس کے بعد تلور کی پکوائی شروع ہوتی ہے جس میں روسٹ، باربی کیو، ہانڈی اور دیگر انداز شامل ہیں. ضیافت میں خشک میوا جات سے بنا سبز ہریرہ، ٹھنڈا چھاچھ، تازہ پھل اور دیگر مشروبات دے جاتے ہیں۔ انواع واقسام کا میٹھا دیا جاتا ہے اور پھر عشاء کی نماز باجماعت ادا ہوتی ہے۔ آخر میں مشائخ اپنے اپنے حجروں میں چلے جاتے ہیں۔ حجروں میں کم سن غیر تجربہ کار دوشیزائیں موجود ہوتی ہیں جن کو تجربہ کار خادماؤں نے پہلے سے اچھی طرح اُبٹن لگا کر عنبر اور مشک سے معطر پانی سے نہلا یا دھلایا ہوتا ہے اور بالوں کی شیمپو سے صفائی کے بعد کنڈیشنر کر کے سکھایا ہوتا ہے۔ ان کو علاقائی انداز میں ملبوس کر کے سونے کے زیورات سے مزین کیا جاتا ہے۔ سختی سے یہ تاکید کی جاتی ہے کہ شیخ کو ناراض بلکل نہیں کرنا ورنہ وہ تمہارے ماں باپ کو مروا دے گا. بیچاری نو عمر بچیاں کم علمی کی بنا پر کچھ بھی پیشین گوئی کرنے سے قاصر جب کسی اچھے خاصے مسٹنڈے شہزادہ کے سامنے پیش ہوتی ہے تو مجھے نہیں معلوم اس بچی کے کیا جذبات ہوتے ہوں گے۔ لیکن سیکورٹی پر مامور ایک شخص کے مطابق حجروں سے جو چیخنے اور چلانے کی آوازیں آتی تھیں وہ کسی عقوبت خانہ سے کم نہیں ہوتیں۔ اسکو اگر ایک خونخوار باز کا کسی چوٹی سی فاختہ پر جھپٹنا کہئے تو غلط نہیں ہوگا۔ کئی بار بچیاں بیہوش ہو جاتی ہیں، لہولہان ہو جاتی ہیں لیکن مشائخ اتنے بھی بے رحم یا سنگدل نہیں ہیں، حاضر سروس ڈاکٹروں اور نرسوں کی ایک ٹیم ہمہ وقت وہاں موجود ہوتی ہے اور ضرورت پڑنے پر ایمبولینس ان کو شہر میں واقع شیخ زائد بن سلطان ہسپتال بھی لے جاتی ہے۔

شائد اسی غرض سے یہ ہسپتال وہاں بنوایا تھا ورنہ بلوچستان اور سرحد میں بھی غربت ہے۔ اللہ کا شکر ہے مشائخ کا دھیان وہاں نہیں پڑا۔ ہسپتال میں یہ مضروب بچیاں اندرونی زخموں کی وجہ سے بعض اوقات کئی دن تک زیر علاج رہتی ہیں مگر ان میں سے اِکا دُکا نحیف الصحت بچیوں کی فوتگی بھی دیکھنے میں آتی ہے۔ ان معصوم لڑکیوں کے والدین غربت کی سطح سے نیچے رہتے ہیں اس لئے ہمت کرنے کا سوچ بھی نہیں سکتے کہ کوئی مقدمہ کریں۔ میں نے جب سیکورٹی والے اہلکار سے دریافت کیا کہ تم کسی بین الاقوامی NGO کو کیوں نہیں بتاتے؟ تو بولا 'صاحب میں مسنگ پرسن نہیں بننا چاہتا'' تلور کے شکار پر جو پابندی عائد تھی اس کو اُٹھا لیا گیا اور کوئی NGO بھی نہیں بولی تو آج مجھے اس سیکورٹی اہلکار کی بات میں صداقت محسوس ہو رہی ہے۔ میرے نزدیک تلور کے شکار کی اجازت درحقیقت کم سن لڑکیوں کی معصومیت کے شکار کا پروانہ تھا۔ (ویکلی جنگ کنیڈا، ۱۴ دسمبر ۲۰۱۶)

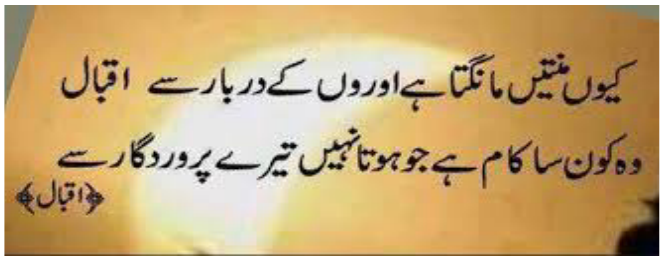

پرانا دور- یہ زمانہ کس کس نے دیکھا ہے؟

ابن لطیف

اُس دور میں ماسٹر اگر بچے کو مارتا تھا تو بچہ گھر آ کر اپنے باپ کو نہیں بتاتا تھا، اور اگر بتاتا تھا تو باپ اُسے ایک اور تھپڑ رسید کر دیتا تھا۔ یہ وہ دور تھا جب ''اکیڈمی'' کا کوئی تصور نہ تھا، ٹیوشن پڑھنے والے بچے نکّمے شمار ہوتے تھے۔ بڑے بھائیوں کے کپڑے چھوٹے بھائیوں کے استعمال میں آتے تھے اور یہ کوئی معیوب بات نہیں سمجھی جاتی تھی۔ لڑائی کے موقع پر کوئی پستول نہیں نکالتا تھا، صرف اتنا کہنا کافی ہوتا تھا کہ ''میں تمہارے ابا جی سے شکایت کروں گا''۔ یہ سنتے ہی اکثر مخالف فریق کا خون خشک ہو جاتا تھا۔ اُس وقت کے ابا جی بھی کمال کے تھے، صبح سویرے فجر کے وقت کڑکدار آواز میں سب کو نماز کے لیے اٹھا دیا کرتے تھے۔ بے طلب عبادتیں ہر گھر کا معمول تھیں۔

کسی گھر میں مہمان آ جاتا تو اِرد گرد کے ہمسائے حسرت بھری نظروں سے اُس گھر کو دیکھنے لگتے اور فرمائشیں کی جاتیں کہ ''پروہنے'' کو ہمارے گھر بھی لے کر آئیں۔ جس گھر میں مہمان آتا تھا وہاں پیٹی میں رکھے، فینائل کی خوشبو میں لپٹے بستر نکالے جاتے، خوش آمدید اور شعروں کی کڑھائی والے تکئے رکھے جاتے، مہمان کے لیے دُھلا ہوا تولیہ لٹکایا جاتا اور غسل خانے میں نئے صابن کی ٹکیا رکھی جاتی تھی۔ جس دن مہمان نے رُخصت ہونا ہوتا تھا، سارے گھر والوں کی آنکھوں میں اُداسی کے آنسو ہوتے تھے، مہمان جاتے ہوئے کسی چھوٹے بچے کو دس روپے کا نوٹ پکڑانے کی کوشش کرتا تو پورا گھر اس پر احتجاج کرتے ہوئے نوٹ واپس کرنے میں لگ جاتا، تاہم مہمان بہرصورت یہ نوٹ دے کر ہی جاتا۔ شادی بیاہوں میں سارا محلہ شریک ہوتا تھا، شادی غمی میں آنے جانے کے لیے ایک جوڑا کپڑوں کا علیحدہ سے رکھا جاتا تھا جو اِسی موقع پر استعمال میں لایا جاتا تھا، جس گھر میں شادی ہوتی تھی اُن کے مہمان اکثر محلے کے دیگر گھروں میں ٹھہرائے جاتے تھے، محلے کی جس لڑکی کی شادی ہوتی تھی بعد میں پورا محلہ باری باری میاں بیوی کی دعوت کرتا تھا۔ کبھی کسی نے اپنا عقیدہ کسی پر تھوپنے کی کوشش نہیں کی، کبھی کافر کافر کے نعرے نہیں لگے، سب کا رونا ہنسنا سانجھا تھا، سب کے دُکھ ایک جیسے تھے، سب غریب تھے، سب خوشحال تھے، کسی کسی گھر میں بلیک اینڈ وائٹ ٹی وی ہوتا تھا اور سارے محلے کے بچے وہیں جا کر ڈرامے دیکھتے تھے۔ دوکاندار کو کھوٹا سکا چلا دینا ہی سب سے بڑا فراڈ ہوتا تھا۔

اردو کے دس بہترین ناول

رجلِ خوشاب

ناولوں کی یہ فہرست ان کی اہمیت، علمی، ادبی اور ثقافتی اہمیت، مطالعے اور مناسبت کے تحت مرتب کی گئی ہے۔ معاف کیجئے گا کہ اس میں نام نہاد ''مقبول فکشن'' یا ڈائجسٹ ادب شامل نہیں یا وہ ادب جسے ڈرامہ دیکھنے والی خواتین سراہتی ہیں۔ لیکن اس بار بھی میں یہی کہوں گا کہ شاید ہی کوئی فہرست ایسی ہوسکتی ہے جس پر ہر ایک متفق ہوسکے۔ تو اگر آپ اس فہرست سے متفق نہیں تو دس بہترین ناولوں کی اپنی کوئی فہرست بنانے کی مکمل آزادی ہے۔ ایک وقت تھا جب نقاد، اردو ناولوں کے متعلق مایوس تھے۔ کئی ایک نے کہا کہ عظیم ناول تو دور کی بات، اردو زبان میں تو ایک درجن ناول بھی ایسے نہیں جنہیں اچھے ناول قرار دیا جا سکے۔ لیکن ناول نگار اور نقاد، عزیز احمد اس سے اتفاق نہیں کرتے۔ اپنے ایک مضمون میں انہوں نے کہا ہے کہ جنہوں نے اردو ادب کا مطالعہ نہیں کیا یا کسی ناول کو گہرائی میں نہیں پڑھا وہی اس طرح کی باتیں کرتے ہیں۔ ایک اور ادیب شہزاد منظر کہتے ہیں کہ آزادی کے بعد کئی اچھے ناول لکھے گئے اور ان کا کہنا ہے کہ 1970 کے عشرے میں میں بہتر ناول منظرِ عام پر آئے۔ شاید اس کی وجہ یہ ہے کہ زرعی معاشروں میں شاعری کو نثر پر فوقیت حاصل تھی اور ناول صنعتی عہد کی پیداوار ہے۔ لیکن گزشتہ پندرہ برسوں میں اچھے اردو ناول تواتر سے شائع ہوتے رہے ہیں۔ مصنف عرفان جاوید کے مطابق لگ بھگ گزشتہ دس سال میں اردو ناولوں کا احیاء ہوا ہے۔

افسانہ آزاد

چونکہ شاید آج مشکل سے اسے ناول کا درجہ مل سکے، ہم ابتدائی اردو ناولوں مثلاً مولوی نذیر احمد کے مراۃ العروس (1869) کو چھوڑ کر ایک شاہکار ناول کی بات کریں گے جسے پنڈت رتن ناتھ سرشار نے لکھا تھا۔ 'افسانہ آزاد' (1878) میں منظرِ عام پر آیا اور اس پر عام اعتراض یہی کیا جاتا ہے کہ اس میں حقیقی پلاٹ کی کمی ہے اور اس کی ضخامت اسے

بہت بھاری بھرکم ناول میں تبدیل کرتی ہے۔لیکن دنیا کے عظیم ترین ناولوں کے ساتھ بھی یہی کچھ معاملہ ہے جن میں 'وار اینڈ پیس' اور 'ی برادرز کراموزوف قابلِ ذکر ہیں۔اس میں خالص اردو میں لکھنو تہذیب کو بیان کیا گیا ہے۔اس میں ایک مسخرا نما کردار خوجی کا بھی ہے جسے اردو ادب کے اولین مزاحیہ کرداروں میں سے ایک قرار دیا جاسکتا ہے۔

امراؤ جان ادا

1899 میں لکھا گیا یہ ناول، اردو ناولوں کے عروج کی ایک لحاظ سے علامت اور اشارہ تھا۔ناقدین کی رائے اب بھی اس پر تقسیم ہے کہ امراؤ کوئی اصلی کردار تھا بھی یا نہیں لیکن یہ ناول مرزا ہادی رُسوا کی فکشن پر زبردست مہارت کو ظاہر کرتا ہے۔بظاہر یہ ایک طوائف کا زندگی نامہ ہے لیکن اسے اُنیسویں صدی کے دوسرے نصف حصے میں لکھنؤ کے تہذیب اور معاشرے کا عکاس ناول قرار دیا جاسکتا ہے۔

گئودان

منشی پریم چند کے تمام ناولوں میں سے گئودان (1936) کو سب سے بہترین کام کا درجہ حاصل ہے۔اس میں ہندوستان کے کسانوں کی تکلیف دو زندگی کو دکھایا گیا ہے۔پریم چند نے دہقانوں پر ہونے والے ظلم کی نقشہ کشی کی ہے۔پریم چند نے پہلے اردو زبان میں لکھنا شروع کیا تھا لیکن دھیرے دھیرے وہ ہندی زبان کی جانب بڑھتے گئے جبکہ گئودان تو سب سے پہلے دیوناگری رسم الخط میں لکھا گیا تھا اور اسے اقبال بہادر ورما ساحر نے اُردو میں ڈھالا تھا۔لیکن اب بھی اسے اردو ناول ہی قرار دیا جاسکتا ہے اور وہ بھی بہترین اردو ناولوں میں سے ایک۔

آگ کا دریا

اسے اردو زبان کا سب عظیم ناول بھی قرار دیا جاتا ہے۔معروف ناول نگار، قراۃ العین حیدر کی تخلیق آگ کا دریا (1957) نے ایسے کئی تنازعات کو جنم دیا جو آج بھی ختم نہیں ہوئے۔اس پر ایک اعتراض یہ بھی ہے کہ یہ ورجینیا وولف کے سوانحی ناول اورلینڈو سے متاثر ہوکر لکھا گیا ہے۔اس ناول کی سوانح عمری تین سو سال پر محیط ہے اور ناول میں مصنفہ نے جو خیالات پیش کئے اس پر انہیں ہراساں بھی کیا جاتا رہا تھا۔اگرچہ اس کے پہلے دو سو صفحات پڑھنا مشکل ہے لیکن اس ناول میں برصغیر کی 2,500 سالہ تاریخ سموئی گئی ہے اور اگر آپ اسے گرفت میں کرنے کی کوشش کرتے ہیں تو گویا تاریخ بھی آپ کو گرفت میں لے لیتی ہے۔

اُداس نسلیں

یہ عبداللہ حسین کا وہ ناول ہے جسے انہوں نے راتوں رات شہرت کی بلندیوں پر پہنچا دیا۔اگرچہ قرۃ العین صدیقی نے عبداللہ حسین پر نقل کے الزامات لگائے تھے اور صفحہ نمبر تک کے حوالے دیئے تھے کہ اس میں آگ کا دریا ناول کا اُسلوب اور پیراگراف شامل کئے گئے ہیں۔لیکن اس کے باوجود اُداس نسلیں آزادی کے بعد تحریر کئے جانے والے اہم ترین اردو ناولوں میں سے ایک ہے۔اس میں دہلی اور پنجاب کے درمیان ایک گاؤں کا منظر پیش کیا گیا ہے جس میں میں ہندو، مسلم اور سکھ بستے ہیں۔

آنگن

1962 میں تصنیف کئے جانے والے اس ناول کو ایک شاہکار قرار دیا جاسکتا ہے۔دیگر فکشن کی طرح اسے تاریخ کی طرح نہیں پڑھا گیا۔یہی اسٹائل خدیجہ کی مقبولیت اور عظمت کی وجہ بنا ہے۔

خدا کی بستی

اردو کے مقبول ترین ناولوں میں سے ایک خدا کی بستی کو شوکت صدیقی نے تحریر کیا ہے اور اب تک اس کے 50 ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں اور 20 زبانوں میں اس کا ترجمہ ہوا ہے۔خدا کی بستی میں پچاس کے عشرے کا کراچی دکھایا گیا اور اس میں کچی بستی کی منظر کشی کی گئی ہے۔خدا کی بستی ایک ایسے معاشرے کی کہانی ہے جو معاشی اور سیاسی نشیب و فراز کے باوجود بقا کی جدوجہد میں مصروف ہے۔اس کی حقیقی زبان اور عامیانہ انداز سے ہر کردار اور منظر حقیقی نظر آتا ہے۔

بستی

انتظار حسین کے بعد ہی ان کا یہ ناول قدرے متنازعہ ہوگیا تھا۔

انتظار حسین پر اکثر یہ اعتراض کیا جاتا ہے کہ وہ بہت ناسٹلجک ہوجاتے ہیں اور یادوں میں گم ہوجاتے ہیں لیکن انتظار حسین کا فن بھی یہی سے شروع ہوتا ہے۔ وہ مایتھولوجی میں حوالہ جات کے ساتھ کہانی کو زبان کی چاشنی سے ایک خوبصورت رنگ عطا کرتے ہیں۔

چاکیواڑہ میں وصال

محمد خالد اختر ایک ممتاز مزاح نگار تھے اور ان کے اس ناول کو فیض احمد فیض نے بھی نامزد کیا ہے۔ اس میں بیان کردہ ہر شے میں طنز و ظرافت کا رنگ موجود ہے۔ لیاری کے علاقے چاکیواڑہ کے پس منظر میں لکھی گئی اس تخلیق میں چاکیواڑہ کے کردار زندہ ہوجاتے ہیں۔

راجہ گدھ

1980 کے عشرے میں لکھے گئے اس ناول میں بانو قدسیہ نے ایک سماجیاتی نظریہ پیش کیا ہے۔ اس میں کہا گیا ہے کہ کرپشن کی ہر شکل کسی نہ کسی ذہنی عارضے کو پیدا کرتی ہے۔ ہمارا معاشرہ بدعنوانی میں گھرا ہے اور اس میں مصنف نے بتایا ہے کہ کسطرح کرپٹ کردار تکلیف اٹھاتے ہیں۔ کئی چاند تھے سرِ آسمان: اگر ناولوں کی اس فہرست میں کوئی دوسرا ہم عصر ہوسکتا ہے تو وہ شمس الرحمان فاروقی کا ناول کئی چاند تھے سرِ آسماں ہوسکتا ہے۔ اس میں برصغیر کا کلچر اور کردار دکھائے گئے ہیں۔ ناول میں غالب کا سراپا پڑھنے کے قابل ہے۔

(ماخوذ ڈان اخبار 12 فروری 2014ء)

اِسلام

ایک عورت نے کسی عالم سے پوچھا: اسلام نے ہمیں شوہر کی اطاعت اور فرماں برداری کا پابند کیوں کیا ہے... شوہر کو ہماری اطاعت کا پابند کیوں نہیں بنایا؟ عالم نے پوچھا: تیرے کتنے بیٹے ہیں؟ عورت بولی: تین بیٹے...

اس پر عالم نے جواب دیا: اللہ نے تجھے ایک مرد کی اطاعت کا حکم دیا.. اور تین مردوں کو تیری اطاعت کا حکم دیا... تیری اطاعت اور تیرے ساتھ اچھا معاملہ کیے بغیر وہ ہرگز جنت میں داخل نہیں ہوسکیں گے... اب تُو بتا کہ زیادہ پابند کس کے ہیں؟!!! عورت نے جواب دیا: بے شک... اسلام کی نعمت پر میں اللہ کا شکر ادا کرتی ہوں... (عربی سے منقول)

زہریلا پمفلٹ

شوکت حیات کے زیرِ طبع ناول کا ایک باب

رو میں ہے رخشِ عمر کہاں دیکھئے تھمے
نے ہاتھ برگ میں ہے نہ پا رکاب میں

دفتر کا ایک چپراسی تھکے ہوئے گھوڑے کی طرح اس کی طرف بڑھا آرہا تھا۔ اسے اندیشہ ہوگیا کہ کوئی ہنگامہ اُٹھ کھڑا ہوا ہے اور بحیثیت جنرل سیکریٹری شاید اسے ڈھونڈا جارہا ہے۔ کچھ دیر پہلے کئی سٹاف مل کر اس زہریلے پمفلٹ کو پڑھ چکے تھے۔ جسے خفیہ طریقے سے بانٹا گیا تھا اور جو اتفاق سے اُن کے ہاتھ میں لگ گیا تھا۔ اس پمفلٹ میں چند نکات مندرجہ ذیل تھے۔ جس وقت کسی لیڈر کی طرف سے تمہیں طلب کیا جائے فوراً تیار ہوجاؤ۔ راستوں میں مارچ کے دوران زوردار پٹاخے چھوڑا۔ حملہ ایسی جگہ کرو جو تمہارے علاقے سے دور ہو تاکہ لوگ تم کو پہچان نہ سکیں۔ سامنے سے حملہ ہرگز نہ کرو بلکہ ہمیشہ پیچھے سے وار کرو۔ رات کی تاریکی میں فساد کی آگ زیادہ بھڑکاؤ۔ کسی بھی قیمت پر پولیس کو اس کا موقعہ نہ دو کہ تمہارے اسلحہ پکڑ سکے۔ اُن کے گھروں میں کام کرتے وقت عورتوں کو رجھانسنے اور پھنسانے کی کوشش کرو اور اپنے لنگ انہیں دکھاؤ اور موقعہ پاکر ان کے ساتھ بدکاری کرو۔ اس پمفلٹ کے بارے میں کچھ دیر پہلے ان کا آپسی مباحثہ بے حد دلچسپ تھا۔ بالکل فلمی انداز کا۔ ''یہ سب حرام زدگی ہے۔ ایک خاص تنظیم اور فرقے کو خوامخواہ بدنام کرنے کی سازش ہے۔ ذرا سوچئے وہ بھی تو آخر انسان ہیں، گوشت پوست کے انسان، ان کی بھی ماں بہنیں اور بیٹیاں ہیں۔ انہیں بھی امن اور شانتی کی ضرورت ہے۔ ایک نے فرمایا۔ ''تو گویا آپ نہیں مانتے کہ فسطائیت کی تلوار ہمارے گلے میں لٹک رہی ہے؟''

دوسرے نے سوالیہ لہجے میں اپنی بات کہی۔ ''سارا معاملہ غلط تقسیم کا رکا ہے اور اس کی ذمہ داری کسی ایک فرقے پر نہیں اس گھناؤنی مقتدر سیاست کے سر جاتی ہے جو سمجھتی ہے تھی کہ یہ ملک متحد رہا تو ایک دن دنیا کے بڑی طاقت بن جائے گا'' تیسرا دور کی کوڑی لایا۔ سچ پوچھو تو دونوں طرف کی معصوم بے گناہ لوگ مفت میں مارے جا رہے ہیں۔ اقتدار کے اس گھناؤنے کھیل میں'' چوتھے نے تیسری کی حمایت کرتے ہوئے کہا۔

پانچویں نے کہا

'' گاندھی جی کا رول بھی صحیح نہیں تھا۔ انہوں نے انگریزوں نہرو اور پٹیل کی دلی منشا اور موقف کا ساتھ دیا۔ مولانا آزاد اور جناح کسی قیمت پر بھی تقسیم نہیں چاہتے تھے۔۔ ذرہ غور کرو کیا وجہ ہے کہ معمولی معمولی باتوں پر ستیہ گرہ کرنے والے گاندھی جی ایسے بڑے ایشو اور مسئلے پر ستیہ گرہ جیسے اپنے آزمودہ اور مجرب نسخے کا استعمال نہیں کیا۔ گاندھی جی انسانیت نواز ضرور تھے لیکن برطانوی سامراج اور ہندوستانی جاگیرداری اور پونجی واد کے حامی تھے۔ اور اسی لئے شہید ببر علی اشفاق اللہ بھگت سنگھ اور دسرے انقلابیوں کی رہائی کے سلسلے میں ان کا رویہ مشکوک تھا۔ یہ لوگ کمیونسٹ تھے اور جاگیردار کی سرمایہ کاری کے مخالف۔''

چھٹے نے بات اُچک لی

'' دیکھو بھائی صاف اور سیدھی بات ہے اس میں کوئی لاگ لپٹ نہیں۔ انگریزوں نے تاج و تخت مسلمانوں سے حاصل کیا تھا جاتے وقت انہیں اس اقتدار کو مسلمانوں کی امانت سمجھتے ہوئے انہیں واپس لوٹانا چاہیے تھا لیکن انگریز ایک سازشی اور مفاد پرست قوم ہے جو ہر معاملہ میں اپنے مفاد کو فوقیت دیتا ہے۔ آزادی اور تقسیم دونوں اس نے اپنے مفاد کے تحت منظور کیا۔

چوتھا گویا ہوا

'' کیوں نہیں دونوں ملکوں ہندستان اور پاکستان کا کنفیڈیشن بن جائے یعنی وفاق نیپال جانے کے لئے جس طرح ہمیں پاسپورٹ کی ضرورت نہیں ہوتی پاکستان جانے کے لئے بھی پاسپورٹ کی ضرورت ختم کیا جائے۔ آخر ہم دونوں سگے بھائی ہیں سوتیلے نہیں... بلکہ ہم دونوں تو جڑواں بھائی ہیں دونوں ملکوں کے درمیان ''نو وارٹریٹی'' کر لیا جائے ذرہ سوچئے یقینا مزہ آئے گا۔ ہم دونوں ہر جگہ آزاد سیاحت کریں گے، گھومیں گے۔ پھریں گے۔ زندگی کا حقیقی لطف اٹھائیں گے۔ ہم دونوں اپنی من چاہی جگہ پر دم توڑتے ہوئے سکون سے نروان اور موکھ حاصل کریں گے جہاں ہمارے بچپن گذرے اس زمین کی گود... تبدیل ہو جائیں گے بچوں میں ماں کی گود باپ کے مشفق کندھے ہم لوگوں کی دنیا آن واحد میں کیا سے کیا ہو جائے گی۔ ہم لوگ آزاد پرندوں میں۔

تیسرے نے فلسفیانہ بات کہی'' میں بہائی مذہب کی کتابوں کی نمائش میں گیا تھا۔ وہاں میں نے بورڈ میں ان کے پیغمبر حضرت بہا اللہ کے اس جملے کو جلی حروف میں لکھا ہوا دیکھا کہ ساری دنیا ایک ملک ہے اور سب انسان اس کے شہری ہیں... ذرا سوچو... بہت پہلے وید میں بھی یہی کہا گیا تھا کہ وسدیو کٹمبھ قرآن شریف میں بھی کہا گیا ہے کہ الحمدللہ رب العالمین۔

سمجھ میں نہیں آتا ہم ٹکڑوں میں بٹ کر آخر کن ملعون کی سازشوں کا شکار ہوئے۔ یقینا مقدت طاقتوں کے... ہم لوگوں کو ان کے خلاف آواز نہیں اٹھانی چاہیے۔ اور آواز ہی نہیں ان کے خلاف بغاوت کرنی چاہیے۔ عملی بغاوت ٹھوس بغاوت انقلاب آفریں بغاوت۔ تو کیوں نہ جرمنی کہ طرح ہم بھی دیوار ڈھا دیں؟ پہلے نے اپنی بات کہنے کے بعد طلب نگاہوں سے سب کی طرف دیکھا۔ میرا خیال ہے یہ پمفلٹ ان لوگوں کی سازش ہے جو خوف کی سائیکی پید اکر کے ووٹ بینک پر قبضہ بنائے رکھنا چاہتے ہیں۔ کچھ دیر کی خاموشی کے بعد پہلے عقلمند نے ایک نیا خیال ظاہر کیا۔ نام نہاد سیکولر طاقتیں کم جواب دہ نہیں جو گھوٹالوں پر پردہ ڈالنے سرخرو بننے اور کرسی برقرار رکھنے کے لئے اس خوبصورت لفظ سیکولرزم کا استعمال کرتی ہیں۔ ذرا سوچو اگر یہ صحیح ہوتے تو سانپوں کو سر اٹھانے کا موقعہ ملتا۔؟ دوسرے نے ایک اور نئی بات کہی۔ جو بھی ہو سیکولرزم بہت خوبصورت تصور ہے چھتیس چھتیس جیسی آنکھوں کو خیرہ کرنے والی گداز گل بدن کے تصور سے زیادہ بہت دیر کی سنجیدہ گفتگو کے بعد ایک کو مذاق سوجھا اس نے آنکھ مارتے ہوئے شوشہ چھوڑا۔ بھائی عجیب زمانہ ہے کہ اک بادشاہ بھی مجرم ہے اور رعایا بھی ابھی سب کے چہروں پر مسکراہٹ ٹھیک سے رینگ بھی نہ پائی تھی کہ کسی نے ایک گہرا نکتہ پیش کر دیا۔ بادشاہت...؟ سب کے سب ہنسنے لگے۔ ان کی کھلکھلاہٹ اور فلک شگاف قہقہے سن کر پیڑوں پر بیٹھے رنگ برنگے برندے اپنے پروں کو پھڑ پھڑاتے ہوئے تیزی سے اُڑ گئے۔ اُڑتے اُڑتے بل کھاتے ہوئے انہوں نے ہنسنے والوں کو اُچٹتی نظر سے دیکھا۔ کیسے جیالے لوگ ہیں۔ اس عالم میں بھی دل کھول کر ہنستے ہیں اور الوداع کہتے ہوئے فضا میں اُونچے اُڑتے چلے گئے اور دور آسمان میں غائب ہو گئے۔ لیکن ہنسی کا دورہ مکمل ہونے کے بعد وہ سب گہرے سوچ میں مستغرق ہو گئے۔

-

دربھنگہ ٹائمز...قصہ اردو ناول کے ایک درویش کا...خورشید حیات

سنہری حروف تہذیب کے قدردان اور ناول پسند قارئین...

یہ قصہ ہے ناول کے اُس درویش کا جو زندگی کی رکاب میں عشق پیچاں کی موٹی تہذیب کو ایک دائمی شکل دینے کیلئے جب نہر عنبریں سے باہر نکلتا تھا تو نئی صدی میں عشق کی واردات قلبی کو ایک معنوی ستاویز کا درجہ مل جات تھا۔تہذیب وتمدن کی تمام رنگارنگی کی بیچ یہ قصہ اُس درویش کا بھی ہے جو بی بی کے مقبرہ کے کے قریب چاند سے جب باتیں کرتا ہے تو عشق کیکلاسکی طہارت،شاہوں فقیروں کی آرام گاہ سے تو کبھی درگاہ زرزری سے باہر نکل کر ایک شہزادی سے ہاتھ پر بیعت کرتا دکھائی دیتا ہے۔یہ قصہ اُس درویش کا ہے جس کے ناول ''چاند ہم سے باتیں کرتا ہے'' کو یکھ مجریگاہ میں بیٹھے پچھلے موسم کے ناقدین کے حیرت سے دروازوں کھڑکیوں گنبدوں والے شہر سے اُبھرنے والی آوازوں کو سن کر حیران ہیں۔چاند جو آسمان سے بہت دیر غائب تھا۔چپکے سے روشن ہو گیا۔اور فرہاد کی جانب دیکھنے لگ گیا۔وقت گزر رہا تھا اور رات گہری ہوتی جارہی تھی۔رات بہت گہری ہوگئی ہے پتری' دادی نے یشودھرا کی جانب دیکھا ہاں اس نے دادی کی تائید کی راگ اور درویش کی بھٹی میں ڈھٹائی آخر موہ حسنین کے ناول کے کردار کو ویش کو بھٹی میں ڈھکیل دیتا ہے اور چندر ماجوسب بھیدوں کو جانتا ہے کبھی شیریں فرہاد تو کبھی لیلیٰ مجنوں کبھی کھجور زمین عشق اور کبھی کرشن کی بانسری بن پہاڑوں آبشاروں کی موسیقی کا حصہ بن جاتا ہے۔

روحانی عشق کا دریا اور نورالحسنین کے وجود میں بہنے والی نیم نیم شہد شہد وقار اساس معنویت کو نیا اعتبار دے جاتی ہے۔رُوح جب آزاد ہو جاتی ہے بدن کی ساری دیواریں ٹوٹ جاتی ہیں پیارے حسنین! محبت کی ٹوٹتی دیواروں کو تم اپنے تخلیقی عمل کا اساس کیوں بناتے ہو میرے بھائی؟ بہت اندھیارا ہے۔مگر یہ بھی ایک سچ ہے کہ اُجاگر تی ایک نئی روشنی کے ساتھ ہر لمحہ آسمان سے اُترتی ہے۔متون کے فطری بہاؤ نورالحسنین ناول کو آفاقی حقیقتوں کے بہت قریب کر دیا ہے۔تخلیقی نثر کی نئی جہتیں کچھ اس طرح اُبھری ہیں جو محبت کی بہتی نہر کو منجمد نہیں ہونے دیتی۔عشق محبت کے تیزی سے بدلتے ہوئے محاورے کے اس موسم میں ''چاند سے باتیں کرتا ہے محبت کی داستان کی لامحدود معنویت کو نئی صدی میں بہنے والی زہریلی فضا کے درمیاں کثیر الجہات بنانے میں کامیاب ہے۔نورالحسنین کے ناول ''چاند سے باتیں کرتا ہے'' کو پڑھنے کے لئے میں نے اُونٹ کو اپنی سواری کیوں چُنا شاید کہ اس ناول کی محبت بدن کردار سے باتیں کرنے کے لئے یہ ضروری رہا ہو۔شاید کے اُونٹ صفت مرداب ریگستانوں میں دکھائی نہیں دیتا۔شاید کے سونے کی طرح چمکتے صحرا سے ہی اکثر محبت کی داستانوں کے چشمے پھوٹتے ہیں۔باون دروازوں اور چھبیس کھڑکیوں والے شہر میں بہنے والے نہر عنبریں میں چاند کچھ اس طرح سے اُتر آیا ہے کہ میرے اندر بیٹھی مائی بھی داستان بدن بابا مائی کے ساتھ پہننے لگی۔نورالحسنین کا دل سنہری تہذیب کے اس آنگن میں لگتا ہے۔جہاں کسی زمانے میں محبت کا ایک روحانی کنواں بھی ہوا کرتا تھا۔نئی صدی میں ''کنواں'' تو ہے مگر پانی نہیں۔حسنین کا تخلیقی ذہن اس کنواں کی تلاش میں محبت کا پر پیچ راستوں کا انتخاب کرتا ہے جہاں گاؤں کی گوری کو لہے پر پانی بھرے مٹکے کو لئے آتی تھیں تو محبت کے الگ الگ مدارج پانی کی شکل میں چھلکتے تھے۔

موجودہ دور میں دو طرح کے رُجحانات کو صاف محسوس کیا جاسکتا ہے ایک جو ڈھاکہ کی ململ کی ساڑھی میں لپیٹ کر اپنے کردار کو ندی میں بھگوتے ہیں اور پھر بدن کی جمالیات کی باتیں کرتے ہیں اور ایک وہ جو جسم سے اجسام تک سفر نہیں کرتے لیکن رُوح سے جسم تک پہنچتے ہیں۔ہمیں پتا ہے کہ جسم کے ساتھ رُوح بھی سفر کرتی ہے۔نورالحسنین کا یہ تیسرا ضخیم ناول جو صفحات پر مشتمل ہے چاند کے بہانے مختلف ادوار کی اسی عشق بدن کی رُوحانی قبا کی بات کرتا ہے۔اُنیس سو چوہتر کے بعد اُردو کہانی کاروں ناول نگاروں کے درمیان نمایاں شناخت قائم کرنے والوں میں ایک اہم

نام نورالحسنین کا بھی ہے۔جن کے یہاں انفرادیت کی تلاش زبردست فنکارانہ عرق ریزی کی صورت میں ظاہر ہوتی ہے۔اوراس کا واضح ثبوت ان کا ناول ''چاند ہم سے باتیں کرتا ہے'' کا ورق ورق ہے۔ناول کے الگ الگ کردار کے ساتھ سفر کرنے پر مجھے محسوس ہوا کہ نورالحسنین کا ہر قدم نئے تخلیقی امکانات کو روشن کرتا چلا گیا ہے۔ناویلا ناول محسوسات اور ادراک کی سرحدوں کو توڑ کر منزل تک پہنچنے کا عمل ہے۔ایک ایسی منزل جہاں پہنچنے کے بعد پھر سے ایک نئی منزل پر بیٹھی داستان اپنی داستان بیان کرتی نظر آتی ہے۔

نورالحسنین ایک ایسے ناول نگار کا نام ہے جس کی زندگی ہر پل ایک نئے اجزاء کی تلاش میں خود ہی داستان لکھتی رہی۔ڈھول باجے سے دور فقیرانہ مزاج سنجیدہ اور بالیدہ لب ولہجہ کے ساتھ تک تاریخی شہر آنگن میں بکھری ہوئی کہانیاں انہیں آج بھی لکھتی رہتی ہیں۔نورالحسنین کا جنم 19مارچ 1950ء کو اورنگ آباد میں ہوا۔اوائل عمری میں ہی والدین کے سائے سے محروم ہو گئے پرانی خانقاہوں،ستونوں،امام باڑوں، پن چکی، درگاہوں بولیوں ٹھولیوں کی بیچ جوان ہوئے اور آکاش وانی کی نوکری کر ڈالی۔گیارہ سال تک جس سے عشق کیا اسی سے شادی کر لی۔مگر جب معصوم عشق 1994ء میں چھوڑ کر چلا گیا تو کہانی سنانے والا یہ بابا ،بابا مائی بن گیا۔کہانی سنانے والے اس بابا مائی کے بعدان کا تیسرا ناول ''چاند ہم سے باتیں کرتا ہے'' جب میرے مطالعہ میں آیا تو احساس ہوا کہ حسنین کے یہاں تاریخی واقعات وجدان کی نور نوعیت لئے مخصوص کیفیت شعور کے ساتھ سوار مظاہر محبت کی داستان رقم کرتے چلے گئے ہیں کہ کرشن اور گوتم کی اس زمین پر محبت کی جڑیں آج بھی بہت گہری ہیں۔سبز گنبدوں سے اُبھرنے والی صدائیں ہمارے ساتھ ہیں پھر نئی صدی میں نفرتوں کے کنکر متے سے ڈر کیسا؟ چلیں جی تھوڑا باہر نکلتے ہیں اب...باتیں اُدھوری ہیں میری طرح اور باہر منجیرا کی آواز آ رہی ہے۔

(23ستمبر 2013،روزنامہ ایکسپریس)

–

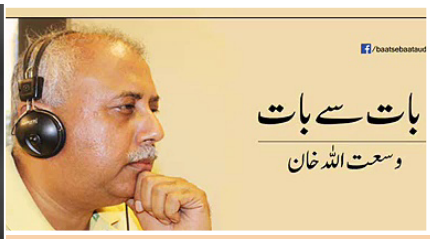

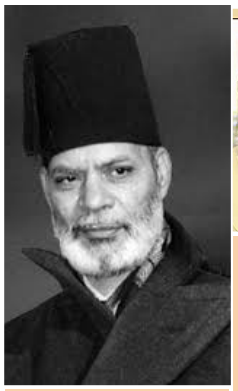

سر ظفر اللہ خان

بغضِ معاویہ یا اسلامی رواداری

کتنے بچوں کو آج بتایا جاتا ہے کہ پاکستان کا پہلا وزیرِ خارجہ ایک احمدی سر ظفر اللہ خان تھا جس نے سات برس تک قراردادِ مقاصد کے معمار سنی العقیدہ نوابزادہ لیاقت علی خان سے محمد علی بوگرا تک تین حکومتوں میں پاکستانی خارجہ پالیسی کو پائلٹ کیا اور پھر عالمی عدالتِ انصاف کا پہلا پاکستانی جج بن گیا۔کیا ہماری نصابی کتابوں میں جسٹس ایلون رابرٹ کارنیلئیس کا ذکر ہے جو ایک دیسی کرسچن تھا اور آٹھ برس تک اسلامی جمہوریہ پاکستان کا چیف جسٹس رہا۔اوراس نے کیسے کیسے اہم فیصلے کیے؟ اور وہ کس قدر درویش طبیعت تھا جس نے زندگی لاہور کے فلیٹیز ہوٹل کے ایک کمرے میں گذار دی۔

کیا کسی آٹھ دس سال کے بچے نے اس ہزارہ جنرل محمد موسیٰ کا نام سنا ہے جس نے سن پینسٹھ کی جنگ میں پاکستانی بری فوج کی کمان کی؟ اور اسی جنگ میں ایک کرسچن فلائٹ لیفٹننٹ سیسل چوہدری کو بھارتی فضائیہ کو چنے چبوانے کے اعتراف میں ستارۂ جرات ملا۔اور کتنی عزت تھی ہم بچوں کے دلوں میں فاتحِ چونڈہ میجر جنرل عبدالعلی ملک اور فاتحِ چھمب جوڑیاں میجر جنرل افتخار جنجوعہ شہید کی۔معاشرتی علوم کے پینسٹھ کی جنگ کے باب میں ان دونوں جنرلوں کی چکنے کاغذ پر بلیک اینڈ وائٹ تصاویر ہوتی تھیں جن میں ایوب خان دونوں کے سینے پر ہلالِ جرات ٹانک رہے ہیں۔

(23ستمبر 2013،روزنامہ ایکسپریس)

شیخ محمد احمد مظہر ایڈووکیٹ بیسیوں صدی کا شہرہ آفاق ماہرِ لسانیات

دوست محمد شاہد پاکستان

کاش سرکش بھی سجدہ کر دیتا عشق کی بارگاہ میں آدمؔ
جذب و مستی کے سب دروازے جانبِ لامکاں ہو جاتے

(آدم چغتائی)

علم لسانیات اتنا ہی قدیم ہے جتنی اقوام عالم کی تاریخ اس بنائ پر بشریات اور عمرانی میں لسانیات کو ہمیشہ ہی ایک مرکزی حیثیت حاصل رہی ہے۔اس علم کا موضوع نہ صرف بے شمار زبانیں ہیں بلکہ جو زبانیں متروک الاستعمال ہوگئیں مثلاً سنسکرت وہ بھی اس کے دائرہ عمل میں آجاتی ہیں۔شیخ محمد احمد مظہر ایڈووکیٹ (وفات ۲۸ مئی 1993ء) بیسوی صدی کے وہ شہرہ آفاق ماہرلسانیات ہیں جنہوں نے اپنی اس تخلیقات سے دنیا میں دھوم مچادی اور کہ ساری زبانوں کا سرچشمہ صرف عربی زبان ہے جو آدم کو الہاماً سکھلائی گئی۔اس دعویٰ کا عملاً ثابت کر دکھانے کا عظیم الشان کام درحقیقت ایک ادارہ کا تقاضا کرتا تھا۔جسکو شیخ محمد احمد مظہر صاحب نے تقریبا چالیس سال کی محنت اور جانفشانی سے کامیابی سے شاندار مراحل تک پہنچادیا ہے اور آپ دنیا کی چھیالیس زبانوں کا لغات حل کر کے ثابت کر سکے ہیں کہ ان کے بنیادی الفاظ کا حقیقی سرچشمہ منطقی اور یقینی طور پر عربی زبان ہے۔آپ کی یہ علمی ریسرچ متعدد کتب کی صورت میں پاکستان، یورپ امریکہ اور افریقہ میں بھی شائع ہو کر منظر عام پر آچکی ہے۔آپ کی کتاب ARABID THE SOURCE OF ALL LANGUAGES پر پاکستان ٹائمز لاہور کے فاضل تبصر ہنگار نے مفصل تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ کتاب کا ہر صفحہ حیرت انگیز اور جو بات بظاہر ناممکن نظر آتی ہے وہ اس کے ذریعہ سے ایک حسابی صداقت کی طرح ثابت ہوچکی ہے اور یہ کتاب دنیا کے لئے ایک چیلنج ہے۔آپ کی دوسری کتاب ENGLISH TRACED TO ARABIC کی نسبت ڈاکٹر وحید قریشی صاحب نے ایک رسالہ ''صحیفہ'' اپریل 1970ء میں یہ رائے دی ہے۔

''مصنف نے لسانیات شعبے میں ایک ایسا صحیح اور محکم نظریہ پیش کیا جس سے اَلسنہ عالم کے اوّلین ماخذ کے متعلق اختلاف ختم ہوجانے چاہئیں۔''

قوم کا زوال کیوں

اے آر خان

کیونکہ جب ہر کوئی کشتی میں اپنے حصہ کو سوراخ کر رہا ہو تو پھر یہ نہیں کہنا چاہیے کہ فلاں کا سوراخ میرے سے بڑا تھا اس لئے کشتی ڈوب گئی۔سبھی قصور وار ہیں۔تو پھر یاد کر لیجئے ایسی قوم کو رونے دھونے اور شکوے شکایتیں کرنے کی بجائے اپنے اعمال پر نظر ثانی کرنی چاہیے۔جس قوم میں بھوک اور افلاس ناچتے ہوں اور حکمران تماشہ دیکھتے ہوں۔جس قوم میں چوکیدار چوروں سے زیادہ لوٹتے ہوں جس قوم کے تاجر، دکاندار سو فیصد ہرام کی کمائی سے حج عمرے کرتے ہوں۔جس قوم کے منصف انصاف کے ترازوں میں دولت کے وزن کے مطابق انصاف کرتے ہوں۔جس قوم کے حکمران پیسہ لگا کر اقتدار خریدتے ہوں۔جس قوم کے دہشت گرد خود کو مجاہد قرار دیتے ہوں۔جس قوم کی فاحشہ دینی مسائل سمجھانے پر لگا دی جاتی ہو اور نام نہاد عالم آن لائن لوگوں کے ایمان کا پوسٹ مارٹم کرتے ہوں۔جس قوم میں جوان بیٹیوں والے غریب بھوکے کے گھر کی دیوار کے ساتھ کروڑوں کی مساجد بنائی جاتی ہوں۔جس قوم کے ملاں عید شب رات کے دن چاند پر ایک دوسرے کو ملامت کرتے ہوں۔جس قوم کے فرائڈیئے بہروپیے عالم دین کا ٹائٹل سجائے ہوئے ہوں۔جس قوم میں ڈاکٹریٹ کی ڈگری قابلیت کی بجائے سفارش اور رشوت کی بنیاد پر دینے کا رواج ہو۔جس قوم کے وزیر جعلی ڈگریاں لے کر اسمبلیوں میں وزیر تعلیم لگ جاتے ہوں۔جس قوم کے جاہل اسمبلیوں میں پہنچا دئے جائیں اور قاتل و مجرم قانون سازی کرتے ہوں۔جس قوم میں پانی کے ٹیکے لگانے والے اپنی کلینک کے ماتھے پر اسپیشلسٹ کا اشتہاری بورڈ لگائے ہوئے ہو۔جس قوم میں فٹ پاتھ پر سانڈے کا تیل لگانے والے اور کیکر کی گوند کو سلاجیت بنا کر بیچنے والے کو ڈاکٹر اور حکیم کہا جاتا ہو۔

جس قوم میں ہاتھ دیکھنے والا اور طوطے سے فال نکالنے والا پروفیسر اور عامل کا باورڈ لگائے بیٹھا ہو۔جس قوم میں ہر ایک نمازی حاجی اور کلمہ گو کو علی الاعلان مسجد کے سپیکرز سے کافر کہا جاتا ہو۔مسجدیں گرائی اور جلائی جاتی ہوں۔اُن پر ناجائز قبضے جائز قرار دیئے جائیں۔جس قوم کے دوائیوں میں، ملاوٹ، کھانے میں ملاوٹ، ایمان میں ملاوٹ، رشتوں میں ملاوٹ کی جاتی ہو جو قوم بیرونی، فرنگیوں کے اشاروں پر ناچے اور وطن فروشی کی مثال قائم ہوجائے۔

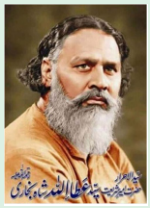

مجلسِ احرار اور قیامِ پاکستان

ڈاکٹر مرزا سلطان احمد

مارچ 1940 کا مہینہ برصغیر کے مسلمانوں کی سیاسی تاریخ میں ایک اہم سنگِ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ 23 مارچ 1940 کو آل انڈیا مسلم لیگ نے لاہور کے اجلاس میں برصغیر کے مشرق اور مغرب میں مسلمان اکثریت کے علاقوں میں علیحدہ ریاستوں کا مطالبہ کیا۔ اس کے ساتھ برصغیر کی سیاست کا رُخ تبدیل ہوگیا۔ اب سیاسی سرگرمیوں کا مرکز صرف آزادی کا مطالبہ نہیں تھا بلکہ یہ سوال بھی ایک مرکزی حیثیت اختیار کر گیا کہ کیا پورا برصغیر ایک ملک کی صورت میں آزاد ہو گا یا علیحدہ ریاستیں جنم لیں گی۔ ہندوستان کے سیاسی منظر پر کانگرس ایک مضبوط حیثیت کی حامل تھی اور اس کی تمام قوت مسلم لیگ کے اس مطالبہ کی مخالفت پر صرف ہو رہی تھی۔ اس سیاسی کشمکش میں یہ بات بھی اہمیت رکھتی تھی کہ مسلم لیگ کے علاوہ دوسری مسلمان تنظیمیں اس مطالبہ کی حمایت کرتی ہیں یا مخالفت کرتی ہیں۔ یقینی طور پر کانگرس کی یہی کوشش تھی کہ مسلم لیگ کے علاوہ دوسری مسلمان تنظیمیں اس مطالبہ کی مخالفت کریں تا کہ سیاسی منظر پر مسلم لیگ تنہا نظر آئے۔ اس وقت جو مسلمان تنظیمیں سرگرم تھیں ان میں سے ایک تنظیم مجلسِ احرار اسلام بھی تھی۔ اس سیاسی مذہبی جماعت کا قیام 1929 میں عمل میں آیا۔ شروع ہی سے اس تنظیم کی سرگرمیوں کا مرکز پنجاب کا صوبہ تھا۔ عملاً احرار کی حیثیت ایسی تھی کہ انہیں کسی نہ کسی بڑی جماعت کے تعاون کی ضرورت رہتی تھی۔ اس وقت منظر پر سب سے بڑی جماعتیں کانگرس اور مسلم لیگ تھیں۔ ابتدا ہی سے احرار کی یہ کوشش تھی کہ مسلمان مسلم لیگ کی بجائے زیادہ سے زیادہ کانگرس میں شامل ہوں۔ 1931 میں مجلسِ احرارِ ہند کے صدر حبیب الرحمن صاحب نے یہ پیغام دیا۔ ''غیر کانگرسی مسلمان کے سامنے سوائے ہندوؤں کو ملامت کرنے انہیں برا بھلا کہنے انگریز اور ہندوؤں سے ہمیشہ مسلمانوں کو ڈرانے کے سوا اور کوئی پروگرام نہیں۔ میری خواہش ہے کہ پنجاب کے مسلمان اس کثرت سے کانگرس میں حصہ لیں کہ دوسروں کو کانگرس میں جگہ نہ مل سکے۔''

1۔ 1953 کے فسادات پر قائم ہونے والی تحقیقاتی عدالت کی رپورٹ میں احرار کے بارے میں لکھا ہے۔ ''...وہ کانگرس سے علیحدہ ہوئے۔ گو اس کے بعد بھی انہوں نے کانگرس سے ملنے جلنے اور اس کے آگے دُم ہلانے کا رویہ جاری رکھا۔ ان کے مسلم لیگ کے درمیان کامل مغایرت تھی''

2۔ مطالبہ پاکستان پر احرار کا ردِعمل مخالفانہ لیکن دلچسپ تھا۔ انہوں نے تقسیمِ برصغیر کے مطالبہ کو مسترد کرتے ہوئے اس کی جگہ ''حکومتِ الٰہیہ'' کا مطالبہ پیش کر دیا۔ ان کا نعرہ تھا ''خلقت خدا کی اور حکم بھی خدا کا''۔ لیکن وہ اس بات کی وضاحت پیش نہیں کر سکے کہ متحدہ ہندوستان میں، جہاں پر ہندو واضح اکثریت میں ہوں گے یہ ''حکومتِ الٰہیہ'' کیسے قائم ہوگی۔

3۔ احرار کے نزدیک مسلم لیگ کے پلیٹ فارم سے پاکستان کا نعرہ لگانے والے 'تن آسان' اور رجعت پسند لوگ تھے۔

4۔ رجو نظام مسلم لیگ کے قائدین قائم کریں گے اس کی ہر شق کفر کے آئین سے ماخذ ہوگی۔

5۔ مسلم لیگ کے قائدین سے یہ اختلاف صرف علیحدہ ملک کے مطالبہ کے بعد سامنے نہیں آیا تھا۔ قراردادِ لاہور سے ایک سال قبل مجلسِ احرار کے سالانہ جلسہ کے خطبہ صدارت میں افضل حق صاحب نے ان خیالات کا اظہار کیا تھا۔ ''لیگ کے اربابِ اقتدار جو عیش کی آغوش میں پلے ہیں۔ اسلام جیسے بے خوف مذہب اور مسلمانوں جیسے مجاہد گروہ کے سردار نہیں ہو سکتے۔ مُردوں سے مرادیں مانگنا اتنا بے سود نہیں۔ جتنا لیگ کی موجودہ جماعت سے کسی بہادرانہ اقدام کی توقع کرنا... اربابِ بصیرت غور کریں کہ لیگ میں بجز سرمایہ کی کشش کے رکھا ہی کیا ہے۔ قربانی و ایثار سے لیگ کا جیب و دامان اب تک تہی ہے۔''

6۔ان سب عوامل کے باوجود احرار کو یہ بھی نظر آ رہا تھا کہ مسلمانوں میں تیزی کے ساتھ علیحدہ ملک کا مطالبہ زور پکڑ رہا ہے۔اور مسلم لیگ اور قائدِ اعظم کی مقبولیت روز بروز بڑھتی جا رہی ہے۔اب احرار کی طرف سے اس قسم کے اُلجھے ہوئے بیانات جاری ہو رہے تھے۔''پاکستانی بھی سن لے۔اکھنڈ ہندوستانی بھی سن لے۔ہم احرار ہیں۔صرف اس کے طرفدار ہیں جو خدا کی حکومت قائم کرے...ہمیں پاکستان اور اکھنڈ ہندوستان کے دامِ فریب میں نہ پھنساؤ۔بلکہ احرار کی سیدھی بات کا جواب دو۔''

7۔ایک مرحلہ پر تو احرار نے یہ کوشش بھی کی کہ وہ مسلم لیگ میں شامل ہو کر اس جماعت پر قبضہ کر لیں، چنانچہ افضل حق صاحب نے 1941 کے احرار کے سالانہ اجلاس کے خطبہ صدارت سے خطاب کرتے ہوئے یہ اعتراف کیا''ہم نے لیگ میں دو دفعہ گھسنے کی کوشش کی تا کہ اس پر قبضہ جما ئیں دونوں دفعہ قاعدے اور قانون نئے بنا دیئے گئے تا کہ ہم بیکار ہو جائیں۔''

8۔تحریکِ پاکستان کو بدنام کرنے کے لیے احرار نے یہ بیانات دینے شروع کیے کہ پاکستان کا مطالبہ اصل میں ہندوؤں اور انگریزوں کی سازش ہے۔افضل حق صاحب کی تقریر کے کچھ حصے ملاحظہ ہوں''سوچ لو پاکستان کی تحریک بھی برطانوی جھانسہ ہی نہ ہو...پاکستان کی تحریک مکانی لحاظ سے نہیں بلکہ زمانی لحاظ سے شرانگیز ہے...مسلم انڈیا کے تخیل کا اوّل پروردگار یہی ہندو ہے۔آجکل کے پاکستانی اسی ہندوانہ ذہن کی پیداوار ہیں...پاکستانی کی خواہشات کو لے کر انگریز کے پاس جاؤ وہ اپنی خوش بختی پر ناز کرے گا کہ تم لعل کے عوض کوئلے لینے آئے ہو۔''

9۔مسلم لیگ اور قائدِ اعظم محمد علی جناح کی مقبولیت تیزی بڑھ رہی تھی۔احرار کو اب اپنے پاؤں تلے سے زمین نکلتی محسوس ہو رہی تھی۔اب ان کے حملوں میں صرف تیزی ہی نہیں بلکہ نیش زنی بھی نمایاں ہوتی جا رہی تھی۔ان کے تیروں کا سب سے زیادہ نشانہ قائدِ اعظم محمد علی جناح کی ذات تھی۔اسی رو میں احراری لیڈر مظہر علی اظہر نے قائدِ اعظم کے متعلق یہ شعر کہا۔اور قیامِ پاکستان کے بعد بھی عدالت میں اقرار کیا کہ وہ اب تک اپنے اس خیال پر قائم ہیں۔ایک کافرہ کے واسطے اسلام کو چھوڑا۔یہ قائدِ اعظم ہے کہ ہے کافرِ اعظم۔

10۔اس سے بات نہیں بنی تو ایسی علی الاعلان ایسی فحش گالیوں پر اُتر آئے جنہیں دُہرانا بھی مناسب نہیں۔

11۔ان کا اعلان تھا کہ وہ پاکستان کو پلیدستان سمجھتے ہیں۔

12۔اس کے علاوہ احرار نے یہ پالیسی اپنائی قائدِ اعظم اور مسلم لیگ کے دیگر قائدین کے خلاف غداری کے ایسے الزامات لگائے جائیں کہ کم از کم پنجاب کے مسلمان ان سے بدظن ہو جائیں۔چنانچہ فروری 1946 میں خود احراری جماعت کے امیرِ شریعت عطاء اللہ شاہ بخاری صاحب نے احرار کے اجلاس میں جو اقرارداد پیش کی تھی اس کا ایک حصہ ملاحظہ ہو''مزید برآں اب مسٹر جناح نے نواب زادہ لیاقت علی خاں کے نظریہ کو اپنا لیا ہے اور سکھوں کی علیحدہ سلطنت بنانے کا حق تسلیم کر کے پنجاب میں جمنا سے راوی بلکہ چناب تک کا علاقہ مغربی پاکستان سے علیحدہ ہونا درُست قرار دیا ہے۔''

13۔اس الزام کا واضح مطلب یہ تھا کہ مسلم لیگ مسلمان اکثریت کے علاقے سکھوں کو دینے کی تیاری کر رہی ہے۔اب جبکہ باؤنڈری کمیشن کی کارروائی شائع ہو چکی ہے، یہ بات ظاہر ہے کہ یہ الزام جھوٹ سے زیادہ کوئی حیثیت نہیں رکھتا تھا۔آزادی سے قبل انتخابات ہوئے اور مسلم لیگ مرکزی اسمبلی کی تمام مسلمان نشستوں پر کامیاب ہو گئی۔احرار کو عبرتناک شکست کا سامنا کرنا پڑا۔وہ پنجاب میں ایک بھی نشست نہ جیت سکے۔اس عوامی فیصلہ کے بعد بھی احرار نے یہی اعلان کیا۔''مسلم لیگ کی قیادت قطعی غیر اسلامی ہے۔اس کا عمل آج تک ملتِ اسلامیہ کے مفاد کے خلاف رہا ہے...مسلم لیگ کے کسی فیصلے کو اسلامی ہند کا فیصلہ قرار نہیں دیا جا سکتا۔''14۔اُس وقت جبکہ تقسیمِ ہند اور قیامِ پاکستان کے لیے مذاکرات چل رہے تھے اس قسم کی قراردادوں کا مقصد صرف پاکستان کی آزادی کی راہ میں روڑے اٹکانا تھا۔الیکشن میں مسلم لیگ کی فتح کے بعد بھی احرار نے یہی قرارداد منظور کی کہ ہندوستان کو متحد رہنا چاہیے اور عطااللہ شاہ بخاری صاحب بھی یہی بیانات دیتے رہے کہ پاکستان کا قیام مسلمانوں کے لیے ہلاکت آفرین اور ہلاکت خیز ہو

گا۔آخر میں اس دلچسپ بات کا ذکر کرنا ضروری ہے کہ انتخابات میں مسلمانوں کی نشستوں پر مسلم لیگ کو فیصلہ کن کامیابی حاصل ہوئی تھی۔اورا س کامیابی کو کانگرس بھی تسلیم کرتی تھی۔لیکن مجلس احرار وہ جماعت تھی جو کہ یہ الزام لگاتی رہی کہ مسلم لیگ نے یہ کامیابی غنڈہ گردی، دھاندلی، اغوا،تشدد اور انگریزوں کی مدد سے حاصل کی ہے ورنہ وہ کبھی بھی یہ فیصلہ کن کامیابی نہ حاصل کر سکتے۔

(بشکریہ نیا زمانہ کنیڈا)

حوالہ جات

1۔رئیس الاحرار مولانا حبیب الرحمن لدھیانوی، مصنفہ عزیز الرحمن جامعی لدھیانوی ،ص154۔2۔رپورٹ تحقیقاتی عدالت فسادات ِ پنجاب 1953 ص272۔3۔حیاتِ امیر شریعت مصنفہ جانباز مرزا، ناشر خالد سعید جانباز، پبلشر مکتبہ تبصرہ لاہور، بار اول نومبر 1969 ص324و343۔4۔ حیاتِ امیر شریعت مصنفہ جانباز مرزا، ناشر خالد سعید جانباز، پبلشر مکتبہ تبصرہ لاہور، بار اول نومبر 1969 ص348۔5۔حیاتِ امیر شریعت مصنفہ جانباز مرزا، ناشر خالد سعید جانباز ، پبلشر مکتبہ تبصرہ لاہور، بار اول نومبر 1969 ص324۔6۔خطباتِ احرار جلد اول، مرتبہ شورش کاشمیری، ناشر مکتبہ احرار لاہور، بار اول مارچ 1944 ص22۔7۔خطباتِ احرار جلد اول ، مرتبہ شورش کاشمیری ، ناشر مکتبہ احرار لاہور ، بار اول مارچ 1944 ص101۔8۔خطباتِ احرار جلد اول، مرتبہ شورش کاشمیری، ناشر مکتبہ احرار لاہور، بار اول مارچ 1944 ص95۔9۔خطباتِ احرار جلد اول، مرتبہ شورش کاشمیری ، ناشر مکتبہ احرار لاہور ، بار اول مارچ 1944 ص42و43۔10۔ رپورٹ تحقیقاتی عدالت فسادات ِ پنجاب 1953 ص11۔11۔ The Ahmadis and the Politics of Religious Exclusion in Pakistan, by Ali Usman Qasmi, published by Anthem Press London p 56۔12۔خطباتِ احرار جلد اول، مرتبہ شورش کاشمیری، ناشر مکتبہ احرار لاہور، بار اول مارچ 1944 ص83۔13۔ حیاتِ امیر شریعت مصنفہ جانباز مرزا، ناشر خالد سعید جانباز، پبلشر مکتبہ تبصرہ لاہور، بار اول نومبر 1969 ص354۔14۔حیاتِ امیر شریعت مصنفہ جانباز مرزا، ناشر خالد سعید جانباز ، پبلشر مکتبہ تبصرہ لاہور، بار اول نومبر 1969 ص355۔۔15۔کاروان ِ احرار جلد ہفتم ،مرتبہ جانباز مرزا، ناشر مکتبہ تبصرہ ص73۔77

۔

گدھا!

سید حسن خان

گدھا انسان کا سب سے پرانا خادم ہے۔اس نے دنیا کے تقریباً ہر گوشے میں قابلِ قدر خدمات انجام دی ہیں۔موجودہ مشینی دور میں بھی جبکہ نقل وحمل کے وسائل میں عظیم اور حیران کن انقلاب آچکا ہے،گدھا بدستور غریبوں کی سواری اور بعض مقامات پر روزگار کا واحد ذریعہ ہے۔گدھے کا حیوانات کے جس خاندان سے تعلق ہے اس کے دوسرے ارکان گھوڑے اور زیبرا ہیں۔ان کا شمار دودھیل(mmals Ma) جانوروں میں ہوتا ہے۔دنیا کے کسی بھی خطے گوشے میں نکل جائیں تپتے ہوئے ریتلے صحراؤں، بے آب وگیاہ چٹیل میدانوں، سنگلاخ اور دُشوار گزار پہاڑوں اور جنگلوں میں تقریباً ہر جگہ آپ گدھا موجود پائیں گے۔ماہرین حیوا نات کا خیال ہے کہ وادیٔ نیل گدھے کی جنم بھومی ہے۔یہیں سے اس کی نسل ایشیا پہنچی۔فلسطین میں بعض مقامات پر کھدائی کے دوران گدھے کی تقریباً تین ہزار سال قبل مسیح پرانی ہڈیاں ملی ہیں۔انجیل میں اس کا جگہ جگہ اس کا ذکر آتا ہے۔گدھا دو قسم کا ہے۔جنگلی اور پالتو۔ماہرین حیوانات کا کہنا ہے کہ گدھا جس نسل کا رُکن ہے ذہانت ،طراری اور پھرتی اس کے نمایاں اوصاف ہیں۔گدھے کی اوسط عمر چالیس سال بتائی جاتی ہے۔**

جناب جہاد میں آپ کے بچے کیوں نہیں شہید ہوئے (ڈبل اسٹینڈر)

رند ملک

ہمارے پیارے کالم نگار ہارون الرشید نے جنرل اختر عبدالرحمن پر ''فاتح'' کے نام ایک دبنگ کتاب لکھی تھی۔ آپ اسے غضب جہاد کی عجب کہانی بھی قرار دے سکتے ہیں۔ مذکورہ کتاب کافی عرصہ پہلے منصۂ شہود پر آئی تھی۔ لیکن اب بھی جناب ہارون الرشید کبھی کبھار اپنے کالم میں جنرل اختر عبدالرحمن کی افغان جہاد میں کامیابیوں اور کامرانیوں کا ذکرِ خیر کرتے دیکھے جاتے ہیں۔ ان کے نزدیک روسی بھیڑیے کو دریائے آمو کے اس پار روکنے میں سب سے بڑا کردار جنرل اختر عبدالرحمن کا ہے۔ ان کی ذہانت پلاننگ اور پتہ نہیں کس کس مہارت کے سبب روسی بھیڑیے گرم پانیوں تک رسائی کی روسی آس دل میں لیے ہی 'پھیتی پھیتی' ہو گئے۔ سوویت یونین کے ٹکڑوں میں بٹنے کا سب سے اہم فیکٹر جنرل اختر عبدالرحمن کو گردانا جاتا ہے۔ ممکن ہے ایسا ہی ہوا ہو۔ جناب ہارون الرشید کا پیارا جنرل اتنا ہی ماہر اور چالباز رہا ہو۔ ایسا کہ دنیا کی ایک بڑی سپر پاور کو ناکوں چنے چبوانے میں اس کا سب سے بڑا ہاتھ ہو۔ لیکن ہمارا سوال تو یہ ہے کہ اگر یہ کسی قسم کا جہاد تھا تو جنرل اختر عبدالرحمن نے اس میں اپنے انوکھے لاڈلے کیوں نہیں جھونکے؟ ان کے بیٹے ہمایوں اختر اور ہارون اختر دونوں شہادت کے عظیم مرتبے سے محروم کیوں رہے؟ آج ہم دیکھتے ہیں کہ جنرل کے دونوں بیٹے پاکستان کے چند امیر ترین لوگوں میں شامل ہیں۔ شوگر انڈسٹری میں ان کا ایک نام ہے۔ سیاست میں بھی وہ کوئی غیر معروف نہیں ہیں۔ پھر افغان جہاد کے باوا آدم جنرل ضیاع الحق کے بیٹے اعجاز الحق اور انوار الحق بھی زندہ و سلامت ہیں۔ انہیں بھی شہادت سے کوسوں دور رکھا گیا۔ جنرل حمید گل ساری زندگی جہاد کا درس دیتے رہے۔ لیکن ان کی اولاد بھی شہادت نہ پا سکی۔ کیوں؟ نام آیا تو واران ٹورز کی بیسیوں بسوں کے ساتھ۔۔ شہادت کے ساتھ کیوں نہیں؟

افغان جہاد میں جماعت اسلامی کا نام کسی تعارف کا محتاج ہے؟ قاضی حسین احمد کو ہم فراموش کر سکتے ہیں؟ مرحوم قاضی حسین احمد کے بیٹے آصف لقمان قاضی کے بارے جب کسی نے کہا کہ وہ امریکہ پڑھتے رہے ہیں تو لوگوں نے حیرت سے دانتوں میں اُنگلیاں داب لیں کہ بھلا یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ جماعت اسلامی کی ساری سیاست ہی ٹھا امریکہ ٹھا امریکہ کرتے گزری ہے۔ انکل سام کے خلاف ریلیاں جلسے جلوس بائیکاٹ دھرنے ہڑتالیں اور کیا نہیں کیا جماعت نے؟ پاکستان میں کبھی کسی بھی صوبے کے نصاب میں کوئی تبدیلی ہونے لگتی تو جماعت کے مجاہدین خم ٹھونک کر میدان میں آجاتے کہ ہم اپنے نوجوانوں کو ملحد نہیں بننے دیں گے۔ ہم نصاب کو سیکولر نہیں ہونے دیں گے۔ ہمیں لبرل نصاب قبول نہیں۔ لیکن یہ کیا کہ امیر جماعتِ اسلامی (قاضی حسین احمد) کا اپنا ہی بیٹا (آصف لقمان قاضی) بنفسِ نفیس اور بقلم خود امریکہ جا کر پڑھنا شروع کر دیتا ہے۔ لوگوں نے حیرت سے سوچا اور پوچھا کہ کیا آصف لقمان قاضی امریکہ منصورہ کا نصاب لے کر گئے تھے؟ اگر امریکہ جا کر آصف لقمان قاضی کا ایمان سلامت رہ سکتا ہے تو باقی لوگوں کے ایمان کو اس سے کیا مسئلہ ہو سکتا ہے؟ اور اسلامی ملک پاکستان میں رہ کر ان کے کسی نصاب کو پڑھنے سے کیا خرابی ہو سکتی ہے؟ خیر اس سوال کا جواب تو آج تک نہیں آیا اُدھر سے۔ ہاں ملک کے ایک نوجوان مصنف صحافی اور ٹی وی اینکر دوست نے جب ہمیں لاہور اپنے آفس میں یہ بتایا کہ معروف جہادی لیڈر حافظ سعید کا بیٹا طلحہ سعید بھی امریکہ سے پڑھ کر آیا ہوا ہے تو سچ پوچھیں کہ ہماری چیخیں نکل گئیں۔ اس صحافی دوست کے بقول دورانِ انٹرویو جب حافظ سعید سے انہوں نے اس بارے سوال کیا تو حافظ سعید صاحب نے اس بات کو آف دی ریکارڈ رکھنے کی درخواست کی تھی۔ کیوں کی تھی؟ یہ جاننے کے لیے کسی بقراطی دانش کی ضرورت نہیں ہے شاید؟ ہمیں تو یہ پتہ ہے کہ جب اس بات کا ذکر ہم نے مری کی سیر کے دوران وہاں اس فکر کی حمایت والی مسجد طیبہ کے کچھ لوگوں سے کیا تو وہ ہم سے تقریباً اُلجھ سے پڑے تھے۔ وہ کسی طور بھی ماننے کو تیار نہیں تھے

کہ ان کے عظیم لیڈر کا لختِ جگر طلحہ سعید کافر اور ظالم ملک امریکہ سے فارغ التحصیل ہے۔ مسلمانوں کے سب سے بڑے دشمن ملک میں ایک جہادی لیڈر کا بیٹا کیسے پڑھ سکتا ہے؟ ہمارے ساتھ موجود دوست ان کمانڈو ٹائپ لوگوں سے ہماری شدید بحث سے کسی قدر خوفزدہ ہو رہے تھے۔ وہ ہمیں اشاروں کنائیوں میں اپیل کر رہے تھے کہ جانے دیں آپ۔ سو ہم نے ان کی مان لی۔ وہ معصوم لوگ چلے گئے تو ہم سوچتے رہے کہ کیا عوام کو بڑے پیمانے پر ایسی تلخ اور سنگین حقیقتیں بتا کر یہاں کچھ بہتری لائی جا سکتی ہے یا نہیں؟ کیا عام لوگوں کو ایسے لیڈروں کے پیروکاروں کو فدائین کو تصویر کا دوسرا اور سب سے روشن رُخ بتانے کا وقت ابھی بھی نہیں آیا؟ ہم یہ سوال چھوڑے جا رہے ہیں۔ غور ضرور کیجئے گا۔ ویسے بھی پرانے سیانے کہہ گئے ہیں کہ کبھی کبھار دماغ کسی اچھے کام کے لیے بھی استعمال کر لینا چاہیے۔

تلخ نوائی - محمد اظہار الحق

(علمائے سُوڈ کٹیٹ کروانا چاہتے ہیں۔ ناقل)

اصل بیماری یہ ہے کہ ایک طبقہ ہماری زندگیوں پر تصرّف چاہتا ہے۔ ہم سانس بھی اس کی مرضی کا لیں۔ لباس بھی اس کی خواہش کا پہنیں۔ اب نوبت یہاں تک آ گئی ہے کہ اپنے پروردگار کو پکارتے وقت بھی صرف اُس کے محدود علم کا خیال رکھیں۔ حضرت! ہم آپ کے آگے ہاتھ جوڑتے ہیں! خدا کے لیے ہمیں ہمارے حال پر چھوڑ دیجیے۔ ہماری زندگیوں میں زہر نہ گھولیے۔ ہمیں ڈکٹیٹ نہ کیجیے۔ Non-Issues کو ہماری زندگیوں کا مقصد و محور نہ بنائیے۔ ابھی ملائیشیا میں آپ نے فیصلہ کیا کہ اللہ کا لفظ غیر مسلم استعمال نہیں کر سکتے۔ انہیں یہ لفظ استعمال کرنے سے پہلے عہد رسالت میں بھی نہ روکا گیا۔ دیکھئے، سورہ یونس: ''تو پوچھ کون روزی دیتا ہے تم کو آسمان سے اور زمین سے یا کون مالک ہے کان اور آنکھوں کا اور کون نکالتا ہے زندہ کو مردہ سے اور نکالتا ہے مردہ کو زندہ سے اور کون تدبیر کرتا ہے کاموں کی سو بول اٹھیں گے کہ اللہ!'' پھر آپ نے بنگلہ دیش میں فتویٰ دیا کہ مسجد میں کرسی کا استعمال جائز نہیں! سعودی عرب سمیت مشرق وسطیٰ کی کسی مسجد میں کرسیاں نہیں رکھی ہوئیں' جدہ کی ایک مسجد میں باقاعدہ صوفے پڑے ہوئے دیکھے۔ ایک مسلمان جو بوڑھا ہے' معذور ہے' کیا کرے؟ کیا وہ نماز پڑھنا چھوڑ دے اور اس لیے کہ آپ خوش ہو جائیں! آپ بغلیں بجا سکیں کہ ہم ہیں ان کی زندگیوں کے مالک! اب پاکستان میں آپ یہ نیا مسئلہ کھڑا کر رہے ہیں کہ خدا کا لفظ استعمال نہ کرو! ایک ہزار سال کا دینی ادب جو ایران' ترکی' وسط ایشیا اور برصغیر میں تخلیق ہوا' آپ کی بے دلیل خواہش کی بھینٹ چڑھا کر نذر آتش کر دیں؟ کچھ تو خدا کا خوف کیجیے۔ آپ اس مفلوک الحال بھوکی' ننگی' کرپشن کی ماری ہوئی قوم سے اس کا خدا بھی چھین لینا چاہتے ہیں۔ پہلے آپ نے فرمایا کہ ٹیلی ویژن حرام ہے۔ جھگڑے ہوئے۔ میاں کے بیوی سے' بیوی کے میاں سے' اولاد کے والدین سے' والدین کے اولاد سے' تعلقات خراب ہوئے' گھر اُجڑے' طلاقیں ہوئیں' پھر ایک دن ٹیلی ویژن ''مسلمان'' ہو گیا۔ بس ایک خاص طبقے کو پروگرام ملنے کی دیر تھی۔ کبھی کہا گیا کہ میز کرسی پر بیٹھ کر کھانا کھانا بدعت ہے! یہ کرسی پارلیمنٹ میں بھی جائز ہے' وزارت میں بھی روا ہے۔ اسلامک ایڈوائزری کونسل میں بھی ''اسلامی'' ہے۔ صرف مدارس کے طلبہ کے لیے ''غیر اسلامی'' ہے! کیونکہ ان کی ننھی منی معصوم زندگیوں پر آپ کو مکمل اختیار ہے! بارش ہو رہی تھی۔ ایک صاحب بھیگتے جا رہے تھے۔ ایک مولانا چھتری لیے اُسی راستے پر گامزن تھے۔ انہوں نے کرم کیا اور چھتری کا ایک حصّہ اُن صاحب کے سر پہ کر دیا۔ ان صاحب نے اِس ''لفٹ'' کا باقاعدہ شکریہ بھی ادا کیا۔ ایک ہفتہ بعد وہ صاحب ایک ریستوران میں اپنے مہمانوں کے ساتھ بیٹھے تھے۔ کہیں سے مولانا نمودار ہوئے اور کہنے لگے' جناب اُس دن میں چھتری مہیا نہ کرتا تو آپ بھیگ جاتے۔ اُن صاحب نے پھر شکریہ ادا کیا۔ لیکن اب مولانا کا یہ معمول ہو گیا کہ وہ جہاں کہیں ان صاحب کو دیکھتے' احسان جتاتے۔ وہ شخص تنگ آ گیا۔ ایک دن وہ ساحلِ سمندر پر سیر کر رہا تھا۔ مولانا بھی وہیں تھے' اس سے پہلے کہ وہ ایک بار پھر جتاتے' اس شخص نے کپڑوں سمیت سمندر میں چھلانگ لگا دی۔ غوطے کھائے' سانس بند کر کے پانی کے اندر چلا گیا' پھر باہر نکلا اور کہا، حضرت! اِس سے زیادہ تو نہ بھیگتا! چنانچہ درخواست ہے کہ آپ اپنی چھتری ہمارے سر سے بے شک ہٹا لیجیے۔ اسلام پر صرف آپ کی اجارہ داری نہیں' جنہیں آپ تکبر سے اور حقارت سے دیکھ رہے ہیں' وہ بھی خدا ہی کے بندے ہیں اور چار حرف انہوں نے بھی پڑھ رکھے ہیں۔ مگر ٹھہریے! آپ کے پاس تو اپنی چھتری ہی نہیں! یہ چھتری جو آپ نے تان رکھی ہے' یہ تو آپ نے خود کہیں سے مانگی ہے! (ماخوذ)

ایک ہر دل عزیز شاعر۔مبارک صدیقی

عاصی صحرائی

مبارک صدیقی کا شمار اُن خوش قسمت قلمکاروں میں ہوتا ہے جنہیں اللہ تعالی نے نظم اور نثر دونوں میں یکساں مہارت عطا فرمائی ہے اور اُنکے اشعار دنوں میں نہیں بلکہ لمحوں میں زبان زدِ عام ہوجاتے ہیں۔ بڑی سی بڑی بات کو انتہائی سادہ سے انداز میں کرنا انکا خاص وصف ہے۔ اُنکی شاعری بھی انکی اپنی ذات کی طرح تصنع اور بناوٹ سے پاک ہے۔ انسان دوست محترم مبارک صدیقی صاحب کو یہ اعزاز بھی حاصل ہے کہ معروف سماجی رُکن عبدالستار ایدھی جب لاہور جاتے تو بطور خاص مبارک صاحب کے گھر ملاقات کے تشریف لے جاتے۔

اس طرح محترم عبدالستار ایدھی صاحب کی انسانیت دوستی نے مبارک صدیقی صاحب کی شخصیت پر بھی گہرے اثرات چھوڑے ہیں اور وہ بھی ہمیں ہمیشہ فلاحی کاموں میں مصروف نظر آتے ہیں۔ آج سے پچیس سال قبل مبارک صدیقی صاحب کو ملک شام کی سیاحت کا موقع ملا اور پھر قسمت کی لکیروں اور تحریروں کے مطابق ایک ناکردہ گناہ میں آپ چالیس دن دمشق کے تہہ خانوں میں قید بھی رہے۔ واپسی پر آپ نے پاکستان میں شام کی ایمبیسی اور پھر اقوام متحدہ کو دمشق میں سیاسی قیدیوں کی حالت زار سے متعلق بے شمار خطوط لکھے۔ اُس زمانے میں کوئی ان کی بات ماننے کو تیار نہیں تھا۔ جب کہ مبارک صدیقی صاحب کی اُس وقت کی لکھی ہوئی کتاب ''دوزخ سے جنت تک'' کے الفاظ آج دنیا حرف بحرف اپنی آنکھوں سے دیکھ رہی ہے۔ معروف شعرائے کرام جناب انور مسعود اور جناب فرحت عباس شاہ صاحب نے بھی آپ کے کلام کو بے حد سراہا۔ ان کے علاوہ شاعری کی دنیا کے بڑے نامور اور معتبر بزرگ شاعر مکرم چوہدری محمد علی مضطرؔ صاحب نے ایک موقع پر فرمایا تھا کہ مبارک صدیقی صرف شاعر ہی نہیں بلکہ مجسم مشاعرہ ہیں۔ اسی طرح دبنگ شاعر جناب رشید قیصرانی صاحب کا کہنا تھا کہ مبارک صدیقی ایک خوبصورت اور جگمگاتا ہوا شاعر ہے جسے دیکھتے ہی چہروں پر مسکراہٹ آجاتی ہے۔

یہاں لندن کے مشاعروں میں مبارک صدیقی صاحب کم کم ہی تشریف لاتے ہیں اور جب آتے ہیں تو خاموشی سے پچھلی نشتوں پر بیٹھ کر مشاعرے سے صرف لطف اندوز ہونے تک ہی اکتفاء کرتے ہیں اور سنانے سے زیادہ سننے کو ترجیح دیتے ہیں۔ گزشتہ دنوں بھی خاکسار نے ایک معروف ٹی وی کی طرف سے ان کے ساتھ ایک خصوصی پروگرام کی دعوت پہنچائی تو وہ حسبِ معمول مسکرا کر ٹال گئے اور اپنی جگہ کسی اور شاعر کو بھجوا دیا۔ تاہم اس سے قبل آپ مختلف ممالک کے مشاعروں میں شرکت کر چکے ہیں جن میں پاکستان برطانیہ جرمنی ہالینڈ ناروے سویڈن اور کینیڈا وغیرہ شامل ہیں۔ آپکی ایک پنجابی کی نظم جو کہ تارکین وطن کے مسائل پر لکھی گئی ہے بے حد مقبول ہوئی۔ اسکے الفاظ کچھ اس طرح ہیں۔

دل کردا سی یورپ جایئے۔ ہیٹ تے کالی عینک پایئے۔ پیٹر رابرٹ یار بنایئے۔ پیزے برگر ڈونر کھایئے۔ ایتھے جان پھسا بیٹھے آں۔ اسی کتھے آں بیٹھے آں۔

اس مضمون میں خاکسار ان کے وہ اشعار پیش کرنے جا رہا ہے جو بہت جلد نوجوان نسل میں مقبول ہوئے۔

دنیا کی دل دُکھانے کی عادت نہیں گئی
اپنی بھی مسکرانے کی عادت نہیں گئی

پھر آپ لکھتے ہیں۔

محبت کو ضرورت ہی نہیں ہے استخاروں کی
یہ جب ہوتی ہے صاحب صورتِ الہام ہوتی ہے

پھر شعر دیکھئے۔

دس بیس میں مل جاتی ہے بازار سے خوشبو
بہتر ہے مگر آئے جو کردار سے خوشبو

آپ کی ایک غزل کے اشعار ملاحظہ ہوں۔

مانا کہ وہ بھی آج تک مانا تو ہے نہیں
ہم نے بھی اُس کے شہر سے جانا تو ہے نہیں
رکھی ہے کوئے یار کی مٹی سنبھال کے
اس سے بڑا زمیں پہ خزانہ تو ہے نہیں
کچھ لوگ تیرے شہر کے خنجر بدست ہیں
کچھ ہم نے باز عشق سے آنا تو ہے نہیں
ملتے ہیں جس خلوص سے ہم ہر کسی کے ساتھ
ویسے یہ اس طرح کا زمانہ تو ہے نہیں
ایک اور غزل کے اشعار ملاحظہ ہوں
دعا کی لو سے میں دیئے جلانے والا ہوں
میں کوئے یار میں جاں بھی لُٹانے والا ہوں
یہ پھول اُس نے مجھے بے سبب نہیں بھیجے
میں اُس کی راہ سے کانٹے اُٹھانے والا ہوں
میں تیرے عشق میں دنیا تو چھوڑ دوں لیکن
میں اپنے گھر میں اکیلا کمانے والا ہوں
مرے قبیلے میں عہدو وفا ہی سب کچھ ہے
سو جان دے کے میں وعدہ نبھانے والا ہوں
میں تیرے ہاتھ کی تحریر کیا کروں کہ تُو
مکر گیا تو میں کس کو دکھانے والا ہوں

شاعر کا خدا تعالی کی ذات پر یقین دیکھئے۔ کیا ہی خوبصورت آپ نے لکھا۔

رضائے یار ہے جب انتہاء تو غم کیا ہے
اگر جدائی تھی اُس کی رضا تو غم کیا ہے
پھر اس سے کیا کہ مقابل ہے کون صف آراء
ہے ساتھ ساتھ جب اپنے خدا تو غم کیا ہے
وصالِ یار کا رستہ ہے قتل گاہوں سے
سو آ گیا ہے اگر کربلا تو غم کیا ہے

دنیا بھر میں ظلم و ناانصافی پر آپکی مزاحمتی شاعری کی ایک مثال دیکھئے۔

ہم تھے گلاب لوگ اور تیشہ بدست وہ
نکلے تھے کر کے ظلم کے سب بندوبست وہ
سمجھے تھے کم نگاہ کہ لکھتے ہیں بخت وہ
پہنچے تھے اپنے زعم میں افلاکِ ہفت وہ
ہم اہلِ دل تھے اور تھے موقع پرست وہ
پھر یوں ہوا کہ کھا گئے سارے شکست وہ
ہم ایک جان آج بھی اور لخت لخت وہ

اُنکی ایک اور نظم جو بے حد مقبول ہوئی۔

جنکی گلیوں میں کانٹے بچھائے گئے
جن کے بستے ہوئے گھر جلائے گئے
وہ جو ہر دور میں آزمائے گئے
بے گناہ جو لہو میں نہائے گئے
ہم وہی لوگ ہیں۔ ہم وہی لوگ ہیں

حمد باری تعالی مبارک صدیقی صاحب کا محبوب موضوع ہے۔ ایک نظم کا پہلا بند ملاحظہ ہو۔

اُس سے مانگ کے دیکھ کبھی اے مورکھ سے انسان
جو کہ جل تھل کر سکتا ہے پیاس کے ریگستان
جس خورشید کو دیکھ کے پگھلیں برف کے بلتستان
جس کا وصل مٹا دیتا ہے ہجر کے راجھستان
ساری دنیا چھوڑ چھاڑ کے اُس سے جا کے مل
رو رو اپنا حال سُنا اور رکھ قدموں میں دل

آپکی شاعری کا ایک خاص وصف اسکی مقصدیت ہے۔ وہ لفظ کی حرمت کو جانتے ہیں اور نغمگی میں مقصدیت کو ہرگز فراموش نہیں کرتے۔

ہجر کی کالی رات میں اُٹھ کے دل کے دل جلا
آنکھ کے مر جانے سے پہلے آنسو چار بہا
نفس کے کالے جادوگر سے جلدی جان چُھڑا
اُسکی یاد میں ایسے رو کہ ہستی جائے ہل
وقت نکال کسی دن تھوڑا اپنے آپ مل
تنہائی میں بیٹھ کسی دن خود سے مانگ حساب
کتنے تُو نے خار چُنے ہیں کتنے پھول گلاب
دو آنکھوں میں پال لئے ہیں تُو نے دو سو خواب

رومانوی اشعار انکی شاعری میں اگرچہ نسبتاً کم ہیں لیکن بہت خوب ہیں۔

خوشبو میں نہائے ہوئے خوابوں کی طرح ہے
وہ شخص تر و تازہ گلابو ں کی طرح ہے
انگور کا پانی ہی ضروری نہیں ساقی
دلبر کا نظار ہ بھی شرابوں کی طرح ہے

ایک اور غزل کے دو اشعار ملاحظہ ہوں۔

دل کسی کے پیار میں سرشار تھا ایسا کہ بس
اور پھر وہ بھی گل و گلزار تھا ایسا کہ بس
میں کہ آیا تھا خزاں کے شہر سے اُجڑا ہوا
وہ کہ اک شاداب برگ و بار تھا ایسا کہ بس
آئینے رکھے ہوں جیسے چاندنی کے شہر میں
سامنے میرے رُخِ انوار تھا ایسا کہ بس

ان کا ایک بہت ہی بے ساختہ سا قطعہ ملاحظہ ہو۔

ڈوبتا جا رہا ہے دل میرا
آج پھر چال لڑکھڑائی ہے
میں گیا تھا طبیب سے ملنے
اُس نے تیری کمی بتائی ہے

ایک لمبی بحر کی نظم کے کچھ اشعار ملاحظہ ہوں۔

یہ رنگ میرے گلاب کر دو، یہ ہجر میرے وصال کر دو
میں چاہتا ہوں کہ آج مجھ پر نگاہِ لطف و جمال کر دو
میں چاہتا ہوں کہ آج مجھ سے گلاب خوشبو اُدھار مانگے
میں چاہتا ہوں کہ آج مجھ پر عنا ئتوں کا کمال کر دو
بچھڑ کے تجھ سے میں ہجرتوں کی، غلام گردش میں کھو گیا ہوں
سو اے مسیحا ملو کچھ ایسے کہ دور سارے ملال کر دو
میں چاہتا ہوں بہشت والوں کو مجھ سے ملنے کی آرزُو ہو
میں چاہتا ہوں کہ مجھ سے پتھر کو بھی ستارہ مثال کر دو

انکی ایک غزل جو کہ مجھے بہت پسند ہے اُسکے کچھ اشعار پیش خدمت ہیں۔

اک حقیقت اتنے افسانوں کے بیچ
میں ابھی زندہ ہوں زندانوں کے بیچ
اور کیا دوں پارسائی کا ثبوت
ہوش میں ہوں عین مے خانوں کے بیچ
وہ جسے اپنوں سے تھیں خوش فہمیاں
رو پڑا وہ شخص بیگانوں کے بیچ
سانحہ یہ ہے کہ تنہاء رہ گیا
آج کا انسان انسانوں کے بیچ
لگ رہی ہیں بولیاں انسان کی
شہر بھر میں اتنی آزانوں کے بیچ

ایک جگمگاتی غزل ملاحظہ ہو۔

دامن تہی اُداس تھا کہتا میں کیا غزل
پلکوں سے ڈھل رہی تھی کوئی جھلملا غزل
میں حرف حرف مانگتا پھرتا تھا اور پھر
اک شخص میرے سامنے تھا سر تا پا غزل
وہ روشنی تھی چار سُو کہ دل تھا زرق برق
وہ حُسن ِ یار تھا کہ گئی جگمگا غزل
اے حُسنِ بے پناہ مجھے چھوڑ کر نہ جا
تُو نہ رہا تو کون سی محفل ہے کیا غزل
عاشق ہے وہ جو یار کی چوکھٹ سے نہ اُٹھے
دلبر جو اک نگاہ سے کر دے عطا غزل

ہماری دعا ہے کہ اللہ تعالی محترم مبارک صدیقی صاحب کی قلم میں اور بھی برکت ڈالے اور آپکا کلام ہمارے دلوں کو گرماتا چلا جائے آمین

ایک مختصر تحقیقی مقالہ
مسلم تاریخ اور چھ کونوں والا ستارہ

مولانا دوست محمد شاہد مرحوم
مؤرخ احمدیت

حال ہی میں ایک سرکاری اعلان جاری کیا گیا ہے کہ عوام اپنے تجارتی نشانوں اور سائن بورڈوں وغیرہ پر چھ کونوں والا ستارہ استعمال نہ کریں۔ کیونکہ یہ ستارہ روایتی یہود کا ستارہ کہلاتا ہے اور یہودیوں اور اسرائیلوں کا خاص نشان ہے۔ اور یہ دور اسلامی اور اسلامی اقدار کی سراسر منافی ہے۔ (نوائے وقت لاہور 24 جنوری 1976ء صفحہ 8)

بلاشبہ اسلامی واقعات کے فروغ کا جذبہ نہایت درجہ قابل قدر چیز ہے۔ جس کی جتنی بھی تعریف کی جائے کم ہے تاہم تاریخ اسلامی کے ایک ابتدائی اور سرسری مطالعہ سے یہ حقیقت پایہ ثبوت تک پہنچتی ہے کہ پہلی صدی سے لے کر چودھویں صدی ہجری کے آغاز تک عرب وعجم کی مسلمان حکومتوں میں چھ کونے کا ستارہ حکومتی سطح پر زیر استعمال رہا ہے۔

دستاویزی ثبوت

اس حقیقت کے متعدد شواہد و دلائل دئے جاسکتے ہیں۔ مگر اس وقت میں مختصر تین دستاویزی ثبوت پیش کرتا ہوں۔

حضرت معاویہؓ کا اسلامی سکّہ

امیر معاویہؓ حضرت عثمانؓ کے بعد عہد خلافت میں پورے ملک شام کے والی تھے۔ آپ نے اپنے زمانہ سلطنت میں جو سکہ جاری کیا اُس میں گول دائرہ سے باہر جو ستارے کندہ تھے وہ چھ کونوں والے تھے۔ ان سکوں کا انکشاف موجودہ صدی میں ہوا ہے اور اُن کی تصاویر مصر کے ممتاز صحافی اور اخبار المقطم کے رکن کتاب احمد داغر اپنی معرکۃ الاراء کتاب ''حضارۃ العرب'' کے صفحہ 56 میں شائع کر چکے ہیں۔ یہ کتاب صاحب الجلالہ حسین الاول بادشاہ عرب کے عہد میں اُنہی کے معنون کی گئی تھی۔ اور مارچ 1918ء میں مصر کے مطبعہ ہندیہ سے زیور طبع سے آراستہ ہوئی تھی۔

لال محل قلعہ آگرہ

مغلیہ خاندان کے بادشاہوں اور فرمانرواں کا دور حکومت مسلم ثقافت وتمدن کا ایک سنہری دور تصور کیا جاتا ہے۔ اور دور میں جو شاندار اور سر بفلک اور یادگاری سرکاری عمارتیں ہندوستان میں تعمیر کی گئیں۔ اُن میں سے عہد جہانگیری کا قلعہ آگرہ میں اور اُس کا پرانا محل خاص طور پر قابل دید ہے جس کو لال محل بھی کہتے ہیں۔ خان بہادر شمس العلماء مولوی ذکاء اللہ صاحب دہلوی مرحوم نے بھی اپنی تاریخ ہندوستان میں جلد ششم میں اس بات کا ذکر کیا ہے اس قلعہ کے صحن بُرج پر ایک جگہ چھ کونوں والے پانچ ستارے اکٹھے نقش کئے ہوئے اب تک موجود ہیں۔ علاوہ ازیں قلعہ کے لال محل کے پھاٹک پر اس طرف کے تین ستارے بنے ہوئے ہیں۔ اور فرانس کے مشہور مستشرق ڈاکٹر گستاولی بان کی مشہور کتاب تمدن ہند کے اردو ایڈیشن صفحہ 400 مطبوعہ مطبع شمسی آگرہ 1913ء میں اس بھاٹک کا واضح اور نمایاں فوٹو مدت سے شائع شدہ ہے۔ تمدن ہند کا اردو ترجمہ شمس العلماء ڈاکٹر سید علی بل گرامی جیسے نہایت بلند پایہ فاضل ومحقق کے قلم سے ہوا ہے جو برسوں تک سرکاری نظام حیدرآباد میں حکومت میں معتمد ریلوے کے عہدہ پر سرفراز رہے اور رائل ایشیاٹک سوسائٹی کے معتمد ممبروں میں سے تھے۔

شیخ حرم نبوی کا شاہی تمغہ

ترکی کی شاندار عثمانی دور اقتدار میں شیخ الحرم انبوی الحافظ المدینہ کا منصب بڑی عقیدت و اُلفت کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔ اور مصر اور دوسرے مسلم ممالک سے آنے والے سرکاری وفود مدینہ کی زیارت کے لئے پہنچتے تو شیخ الحرم سے بھی ملاقات حاصل کرتے 1901ء میں یہ قابل فخر اور مقدس افراد بزرگ الفریق عثمان باشا فرید کو حاصل تھا چنانچہ ابراہیم رفعت پاشا جو مصری قافلہ کے امیر الحجاج تھے 13 محرم 1319ھ کو داعیہ رسول پر حاضر ہوئے اور انہوں نے محافظ شیخ الحرم النبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے بھی ملاقات کی جس کا ذکر اُن کی نہایت گراں قدر اور مبسوط کتاب 'مرءاۃ الحرمین جز اول صفحہ 383 مطبوعہ 1945ء میں ملتا ہے۔ ابراہیم رفعت

پاشا نے یہ پُر از معلومات تصنیف جو حرمین شریف کے حالات کا نہایت ایمان افروز مرقع اور مستند تاریخی تصاویر سے منزہ ہے۔ بادشاہ مصر فواد اوّل کے نام پر انتساب کی اور حضرت صاحب الدولۃ الرئیس الجلیل'' سعد زغلول پاشا وزیر اعظم مصر نے اس کتاب پر مولفِ کتاب کو پُر زور الفاظ میں خراج تحسین ادا کیا۔ ابراہیم نعت پاشا نے اپنی کتاب کے صفحہ 382 پر شیخ الحرام النبوی ﷺ کا فوٹو بھی دیا ہے۔ شیخ الحرام النبوی ﷺ کے چہرہ پر مشرع داڑھی بہت پیاری اور خوبصورت معلوم ہوتی ہے سر پر ترکی ٹوپی رکھی ہے اور شاہی وردی زیب تن کئے ہوئے ہیں۔ سینہ پر جو شاہی تمغے آویزاں ہیں۔ اُن میں سے ایک تمغہ جو دائیں گریبان کے قریب ہے۔ چھ کونوں والے ستارہ کی شکل میں ہے۔ جو نمایاں طور پر دکھائی دے رہا ہے۔

خلاصہ

الغرض مسلمانوں کی اموی مغل اور عثمانی حکومتوں میں چھ کونوں والا ستارہ یقینی اور قطعی طور پر استدلال کیا جاتا تھا۔ اور شاہی سکے شاہی عمارتیں اور شاہی تمغے پر دوسرے نشانوں کے علاوہ اس کو بھی خاص اہمیت دی جاتی تھی۔ کہا جا سکتا ہے کہ وسط ایشیاء کے مسلمان مغل اور ترک تو زمانہ نبوی سے بہت صدیوں بعد برسر اقتدار ہوئے مگر امیر معاویہؓ کا عہد حکومت تو خلافت راشدہ کے مبارک عہد سے بالکل پیوست تھا۔ جس میں سیدنا حضرت امام حسن علیہ السلام حضرت ابن عباسؓ اور سمرہ بن جُندبؓ۔ حضرت حسان بن ثابت حضرت اُسامہ بن زید حضرت ابوموسی اشعری حضرت براء بن عازبؓ حضرت ابوسعید خدریؓ اور خادم الرسول حضرت انس بن مالکؓ رضی اللہ عنہم جیسے اکابر صحابہ زندہ موجود تھے۔ اگر یہ چھ کونوں والا ستارہ صرف یہود سے مخصوص اور اسلامی روایات شعار کے خلاف اور منافی ہوتا۔ تو وہ حضرت معاویہ کے جاری کردہ سکوں پر ضرور صدائے احتجاج بلند کرتے۔ اور شمالی افریقہ سے لے کر ایران تک ایک شور قیامت برپا ہو جاتا۔ مگر اس دنیا کے پردہ پر وہ کونسا محقق ہے جو یہ ثبوت دے سکے کہ ان بزرگ صحابہؓ میں سے کسی نے بھی اس سکہ پر کوئی تنقید کی ہو۔

—

معراجِ محبت مسجد نبوی

بلال افتخار

لوگ تاج محل کو محبت کی علامت قرار دیتے ہیں۔ مگر یقین کریں کہ عثمانی دور میں مسجد نبوی کی تعمیر تعمیرات کی دنیا میں محبت اور عقیدت کی معراج ہے، ذرا پڑھئے اور اپنے دلوں کو عشق نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام سے منور کریں ترکوں نے جب مسجد نبوی کی تعمیر کا ارادہ کیا تو انہوں نے اپنی وسیع و عریض ریاست میں اعلان کیا کہ انہیں عمارت سازی سے متعلق فنون کے ماہرین درکار ہیں، اعلان کرنے کی دیر تھی کہ ہر علم کے مانے ہوئے لوگوں نے اپنی خدمات پیش کیں، سلطان کے حکم سے استنبول کے باہر ایک شہر بسایا گیا جس میں اطراف عالم سے آنے والے ان ماہرین کو الگ الگ محلوں میں بسایا گیا، اس کے بعد عقیدت اور حیرت کا ایسا باب شروع ہوا جس کی نظیر مشکل ہے، خلیفہ وقت جو دنیا کا سب سے بڑا فرمانروا تھا، شہر میں آیا اور ہر شعبے کے ماہر کو تاکید کی کہ اپنے ذہین ترین بچے کو اپنا فن اس طرح سکھائے کہ اسے یکتا و بیمثال کر دے، اس اثنا میں ترک حکومت اس بچے کو حافظ قرآن اور شہسوار بنائے گی، دنیا کی تاریخ کا یہ عجیب و غریب منصوبہ کئی سال جاری رہا، 25 سال بعد نوجوانوں کی ایسی جماعت تیار ہوئی جو نہ صرف اپنے شعبے میں یکتائے روزگار تھے بلکہ ہر نوجوان حافظ قرآن اور باعمل مسلمان بھی تھا، یہ لگ بھگ 500 لوگ تھے، اسی دوران ترکوں نے پتھروں کی نئی کانیں دریافت کیں، جنگلوں سے لکڑیاں کٹوائیں، تختے حاصل کئے گئے اور شیشے کا سامان بہم پہنچایا گیا، یہ سارا سامان نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام کے شہر پہنچایا گیا تو ادب کا یہ عالم تھا کہ اسے رکھنے کے لیے مدینہ سے دور ایک بستی بسائی گئی تاکہ شور سے مدینہ کا ماحول خراب نہ ہو، نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کے ادب کی وجہ سے اگر کسی پتھر میں ترمیم کی ضرورت پڑتی تو اسے واپس اسی بستی بھیجا جاتا، ماہرین کو حکم تھا کہ ہر شخص کام کے دوران باوضو رہے اور درود شریف اور تلاوت قرآن میں مشغول رہے، ہجرہ مبارک کی جالیوں کو کپڑے سے لپیٹ دیا گیا کہ گرد غبار اندر روضہ پاک میں نہ جائے، ستون لگائے گئے کہ ریاض الجنت اور روضہ پاک پر مٹی نہ گرے، یہ کام پندرہ سال تک چلتا رہا اور تاریخ عالم گواہ ہے ایسی محبت ایسی عقیدت سے کوئی تعمیر نہ کبھی پہلے ہوئی اور نہ کبھی بعد میں ہوگی۔ سبحان اللہ! اللھم صل علی سیدنا و مولانا محمد وعلی ازواجہ وآلہ واصحابہ وغلمانہ وبارک وسلم۔

زنانہ اُردو خط و کتابت

(شفیق الرحمٰن)

شوہر کو خط۔ سرتاج من سلامت!۔ کورنش بجالا کر عرض کرتی ہوں کہ منی آرڈر ملا۔ سب سے پہلے آپ کے بتائے ہوئے ضروری کام کے متعلق لکھ دوں کہ کہیں باتوں میں یاد نہ رہے۔ آپ نے تاکید فرمائی ہے کہ میں فوراً بیگم فرید سے مل کر مکان کی خرید کے سلسلے میں ان کا آخری جواب آپ کو لکھ دوں۔ کل ان سے ملی تھی۔ بڑے تپاک سے ملیں۔ کہنے لگیں اگلے ہفتے برخوردار نعیم کا عقیقہ ہے اور اس سے اگلی جمعرات کو نورِ چشمی بتول سلمہا کی رخصت ہوگی، ضرور آنا۔ سوچ رہی ہوں جاؤں یا نہ جاؤں۔ دو ڈھائی سو خرچ ہو جائیں گے۔ نیا جوڑا سلوانا ہوگا۔ ویسے تو سردیوں کے لئے سارے کپڑے نئے بنوانے پڑیں گے۔ پچھلے سال کے کپڑے اتنے تنگ ہو چکے ہیں کہ بالکل نہیں آتے۔ آپ بار بار سیر اور ورزش کو کہتے ہیں بھلا اس عمر میں مستانوں کی طرح سیر کرتی ہوئی اچھی لگوں گی۔ ورزش سے مجھے نفرت ہے۔ خواہ مخواہ جسم کو تھکانا اور پھر پسینہ الگ۔ نہ آج تک کی ہے نہ خدا کرائے۔ کبھی کبھی کار میں زنانہ کلب چلی جاتی ہوں، وہاں ہم سب بیٹھ کر نٹنگ کرتی ہیں۔

واپس آتے آتے اس قدر تکان ہو جاتی ہے کہ بس۔ آپ نے جگہ جگہ شاعری کی ہے اور اُلٹی سیدھی باتیں لکھی ہیں۔ ذرا سوچ تو لیا ہوتا کہ بچوں والے گھر میں خط جا رہا ہے۔ اب ہمارے وہ دن نہیں رہے کہ عشق وشق کی باتیں ایک دوسرے کو لکھیں۔ شادی کو پورے سات برس گزر چکے ہیں، خدارا ایسی باتیں آئندہ مت لکھئے۔ توبہ توبہ اگر کوئی پڑھ لے تو کیا کہے۔ ڈاکٹر میری سٹوپس کی کتاب ارسال ہے۔ اگر دکاندار واپس لے لے تو لوٹا دیجئے۔ یہ باتیں بھلا ہم مشرق کے رہنے والوں کے لئے تھوڑی ہیں۔ اس کی جگہ بہشتی زیور کی ساری جلدیں بھجوا دیجئے۔ ''ایک کتاب گھر کا حکیم'' کی بڑی تعریف سنی ہے۔ یہ بھی بھیج دیجئے۔ چند نئی فلمیں دیکھیں، کافی پسند آئیں۔ ہیرو کا انتخاب بہت موزوں تھا۔ موٹا تازہ، لمبے لمبے بال، کھوئی کھوئی نگاہیں، کھلے گلے کا کرتہ، گانے کا شوق، کسی کام کی بھی جلدی نہیں، فرصت ہی فرصت۔ آپ بہت یاد آئے۔

شادی سے پہلے میں آپ کو اسی روپ میں دیکھا کرتی تھی۔ کاش کہ آپ کے بھی لمبے لمبے بال ہوتے، ہر وقت کھوئی ہوئی نگاہوں سے خلا میں تکتے رہتے، کھلے گلے کا کرتہ پہن کر گلشن میں گانے گایا کرتے۔ نہ یہ کم بخت دفتر کا کام ہوتا اور نہ ہر وقت کی مصروفیت لیکن خواب کہاں پورے ہوئے ہیں۔ ایک بہت ضروری بات آپ سے پوچھنا تھی۔ زینت بوا نے شبہ میں ڈال دیا ہے کہ آپ کے لفافوں پر پتہ زنانہ تحریر میں لکھا ہوا ہوتا ہے۔ ممکن ہے کہ آپ کے دفتر میں کوئی سیکرٹری یا سٹینو وغیرہ آ گئی ہو اور آپ مصروفیت کی بنا پر اس سے پتہ لکھواتے ہوں۔ یہ لڑکی کس عمر کی ہے؟ شکل وصورت کیسی ہے؟ غالباً کنواری ہوگی؟ اس کے متعلق مفصل طور پر لکھئے۔ اگر ہو سکے تو اس کی تصویر بھی بھیجئے۔ باقی سب خیریت ہے اور کیا لکھوں۔ بس بچے ہر وقت آپ کو یاد کرتے رہتے ہیں۔ اصغر پوچھتا ہے کہ ابا میری سائیکل کب بھیجیں گے۔ آپ بہت یاد آتے ہیں۔ ننھے کی جرابیں پھٹ چکی ہیں۔ ننھی کے پاس ایک بھی نیا فراک نہیں رہا۔ برا ہو پردیس کا۔ صورت دیکھنے کو ترس گئے ہیں۔ امی جان کی اونی چادر اور کمبلوں کا انتظار ہے۔ ہر وقت آپ کا انتظار رہتا ہے۔ آنکھیں دروازے پر لگی رہتی ہیں۔ صحن کا فرش جگہ جگہ سے اُکھڑ رہا ہے۔ مالی کام نہیں کرتا۔ اس کی لڑکی اپنے خاوند کے ساتھ بھاگ گئی ہے۔ سرتاج کو کنیز کا آداب۔ فقط آپ کی...

سات تباہ کُن گناہ

حدیثِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم

حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''سات تباہ کُن گناہوں سے بچو'' لوگوں نے پوچھا وہ کونسے گناہ ہیں؟

آپؐ نے فرمایا: 1۔ اللہ کے ساتھ کسی کو شریک کرنا 2۔ جادو کرنا

3۔ کسی کو ناحق مار ڈالنا 4۔ سُود کھانا 5۔ یتیم کا مال ہڑپ کر جانا

6۔ میدانِ جہاد سے بھاگ جانا 7۔ نیک عورتوں پر تہمت لگانا

(بخاری، مسلم، ابوداؤد، سنن النسائی)